سیریز
خون کے پیاسے
اشتیاق احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سجاد علی بھٹی

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

آفتاب، آصف، فرحت اور انسپکٹر کامران سیریز ۲۱

خون کے پیاسے

اشتیاق احمد

خوب
اور خوبصورت کتابیں

حقوق اشاعت محفوظ

ناشر ———— اشتیاق احمد

تزئین ———— محمد سعید نامدار

سرکولیشن ———— محمد یار ببر

کمپیوٹر کمپوزر ———— ظہیر غوری

قیمت ———— 36 روپے

[illegible] سے چھپوا کر اناز بک ڈپو لاہور سے شائع کیا۔

اناز بک ڈپو 3 ... لاہور

فون 7246356 - 7112969

دو باتیں

ہر قدم، ہر موڑ اور ہر صفحے پر اگر آپ کو چونکنا پڑ جائے اور آپ چونک چونک کر تھک جائیں، لیکن اس پر بھی کہانی آپ کو چونکاتی چلی جائے تو مجھے سو فیصد یقین ہے کہ آپ خود چونکتے ہو جائیں گے۔ اب یہ اور بات ہے کہ چونکتا پن بھی آپ کے کام نہ آئے اور کہانی آپ کو چکمہ دے جائے۔ پھر اگر آپ کو کوئی آدمی چکمہ دے تو آپ کو جھنجھلاہٹ، تلملاہٹ اور بوکھلاہٹ کا شکار ہونا پڑتا ہے، لیکن اگر کوئی کہانی آپ کو چکمہ دے جائے تو آپ کو ایک عجیب طرح کا سکون ہوگا۔ اطمینان ہوگا اور مسرت ہوگی۔ اب دیکھیے۔ ایک کہانی آپ کو کیا کچھ دے گئی اور آپ آخر تک سے جانتے کیا ہیں۔ خون کے پیاسے آپ کو کچھ اسی قسم کے حالات سے دوچار کرے گی۔ آپ پوری کہانی میں خون کے پیاسوں کو ڈھونڈتے ہی رہ جائیں گے اور بعض اوقات تو یہ خیال کرنے لگیں کہ اس مرتبہ ناول کا نام غلط رکھا گیا، لیکن پھر یکایک آپ کی ملاقات خون کے پیاسوں سے ہو جائے گی اور اس وقت آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ کہانی واقعی آپ کو چکمہ دے گئی۔ اب بس، کہیں یہ دو باتیں بھی چکمہ نہ دے جائیں اور اگلے صفحے کی طرف رخ نہ کر لیں۔

اشتیاق احمد

ترتیب

وصیت نامہ

کمرے کا منظر دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے شام کے منظر میں اور اس وقت کے منظر میں کس قدر فرق تھا ــــ شام اس حویلی میں سالگرہ کا جشن منایا جا رہا تھا اور اب ــــ

نعمان احمد نے اپنے بیٹے خالد احمد کی بیسویں سالگرہ دھوم دھام سے منانے کا فیصلہ کیا تھا اور اس سلسلے میں اُنھوں نے اپنے سبھی قریبی دوستوں کو بلایا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ان میں انسپکٹر کامران مرزا شامل نہ ہوتے۔ کسی کی سالگرہ پارٹی میں انسپکٹر کامران مرزا شامل ہوں اور آفتاب اور آصف شامل نہ ہوں، یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا ــــ سونے پر سہاگہ یہ کہ ان دنوں تو فرحت بھی یہیں تھی۔ لہٰذا وہ بھی اُن کے ساتھ آئی تھی؛ البتہ شہناز بیگم نے اپنا پیچھا بچا لیا تھا اور وہ اس لیے کہ ان کے سر میں ہلکا سا درد تھا، بلکہ شاید درد سالگرہ کے ہنگامے میں اور بڑھ جاتا؛ چنانچہ انھوں نے آرام کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ چاروں نعمان احمد کے گھر آ گئے۔

رات کے دس بجے تک سالگرہ کا ہنگامہ رہا اور آخر مہمان رخصت

ہوتا نظر آتا ہوئے۔ انسپکٹر کامران مرزا اٹھنے لگے تو خان احمد بولے۔

"جی یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیا نہیں ہو سکتا۔" انھوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی — مطلب یہ کہ تم نہیں جا سکتے۔"

"واہ یہ کیا کہا — میں نہیں جا سکتا — آخر کیوں؟" انسپکٹر کامران مرزا حیران ہو کر بولے۔

"بس آج کی رات تم یہیں گزارو گے۔ صبح کا ناشتا میرے ساتھ کرو گے اور اس کے بعد یہاں سے رخصت ہو سکتے ہو۔"

"اوہو — یہ تو بہت لمبا پروگرام ہے۔ جب کہ مجھے آج رات کچھ خاص فائلوں پر کام کرنا ہے۔ فائلیں گھر پہنچ چکی ہوں گی — اب کیا کیا جائے۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر آفتاب، آصف اور فرحت کو یہاں چھوڑ جاؤ — اور صبح یہاں پہنچ جاؤ، ناشتا بہرحال تمھیں صبح یہیں کرنا ہوگا۔"

"پھر منظور ہے — بشرطیکہ — ان تینوں کو کوئی اعتراض نہ ہو۔"

"انھیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے — کیوں بھئی۔"

"جی کچھ کہہ نہیں سکتے کہ اعتراض ہو سکتا ہے یا نہیں۔" آفتاب نے معصومانہ انداز میں کہا اور خان احمد ہنس پڑے۔

"ٹھیک ہے، تو پھر یہ طے رہا۔ میں اس وقت واپس جاؤں گا۔ یہ تینوں یہیں رہیں گے اور صبح میں یہاں آکر سب کے ساتھ ناشتا کر کے

انھیں لے جاؤں گا۔" آخر انسپکٹر کامران مرزا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے — اب تم شوق سے جا سکتے ہو۔" خان احمد نے خوش ہو کر کہا۔

اور انسپکٹر کامران مرزا وہاں سے رخصت ہو گئے۔

"کیوں بھئی — انھیں واقعی فائلوں پر کام کرنا تھا یا بہانہ بنا گئے ہیں۔" خان احمد نے ان سے پوچھا۔

"جی — ہم نے تو آج تک انھیں جھوٹ بولتے سنا نہیں۔" آصف نے فوراً کہا۔

"جی ابا جان بہانے وہانے بنانے کے عادی ہیں۔ جو بات ہوتی ہے، صاف اور سیدھی کہہ دیتے ہیں۔" آفتاب بولا۔

"اگر انھیں کام نہ ہوتا تو کبھی نہ جاتے اور آپ کی خواہش کے احترام میں ضرور یہاں رکتے۔" فرحت بولی۔

"گویا میرے ہر سوال کے تین جوابات مجھے دیے جائیں گے۔" خان احمد ہنس کر بولا۔

اسی وقت خاور احمد انگلی پر ایک سنہری زنجیر گھماتا اندر داخل ہوا۔ یہ ایک لمبے قد کا خوبصورت نوجوان تھا۔

"ڈیڈی، سب مہمان رخصت ہو چکے ہیں — کیا اب میں آرام کرنے کے لیے جا سکتا ہوں۔"

"نہیں بیٹے — آج کی رات بہت اہم ہے — تم ابھی سونے کے

پتے نہیں جا سکتے۔"

"جی — کیا مطلب — بہت اہم بات ہے۔" شاہد احمد نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں — دیکھو — میں نے انسپکٹر کامران مرزا کے بچوں کو یہیں روک لیا ہے — ان کی باتیں تمہاری نیند اُڑا دیں گی اور تم سونے کے لیے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرو گے۔"

"میں سمجھا نہیں — آپ مجھے جگانا کیوں چاہتے ہیں۔" شاہد احمد نے حیران ہو کر کہا۔ ان تینوں نے بھی ان کی طرف حیرت سے دیکھا۔

"دو گھنٹے بعد وکیل صاحب یہاں آنے والے ہیں — آج میں تمہارے سامنے اپنا وصیت نامہ لکھوانے والا ہوں۔" خان احمد نے کسی قدر اُداس آواز میں کہا۔

"جی کیا مطلب!"

"بھئی زندگی کا کیا بھروسہ — میں چاہتا ہوں، اپنی ساری دولت اور جائیداد کے متعلق اپنی زندگی میں فیصلہ کر جاؤں — میرے بعد یہ سب کچھ تو تمہارا ہی ہوگا — لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ تحریر میں آ جائے تاکہ میرے بعد تمہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔" خان احمد بھرائی ہوئی آواز میں کہتے چلے گئے۔

"بھلا مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔" شاہد احمد نے پریشان ہو کر کہا۔

"تم اس دنیا کو اتنا نہیں جانتے، جتنا کہ میں — اس وقت تو تم ان

لوگوں سے باتیں کرو — دراصل وکیل صاحب کو آج ایک ضروری پارٹی میں جانا پڑ گیا، ورنہ ان کا پروگرام تو سالگرہ کے وقت آنے کا تھا۔ وہ سالگرہ میں باقاعدہ شرکت کرتے اور مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد وصیت نامہ تحریر کرتے — خیر کوئی بات نہیں، دو گھنٹے بھی تو گزرنے ہیں۔"

"لیکن ڈیڈی، آپ تو جانتے ہی ہیں، میں بہت جلد سو جانے کا عادی ہوں — میری نیند بہت گہری ہے اور صبح سے پہلے میں اُٹھ بھی نہیں سکتا۔" شاہد احمد نے بے چین ہو کر کہا۔

"میں سب کچھ جانتا ہوں — لیکن تم ان تینوں کو نہیں جانتے، جب تم ان کے ساتھ باتیں شروع کرو گے تو نیند تمہیں کوسوں دور بھاگتی معلوم ہوگی — اب تم یہیں بیٹھو — میں ملازمین کو ساتھ لے کر تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کرا آؤں۔" یہ کہہ کر خان احمد اُٹھے اور کمرے سے نکل گئے۔

"یہ دروازے اور کھڑکیاں بند کرانے والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"ڈیڈی وہمی ہو گئے ہیں — بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کچھ تھوڑے سے پاگل بھی ہو چکے ہیں تو بے جا نہیں ہوگا۔ ہر رات کو سونے سے پہلے ملازمین کو ساتھ لے کر اپنے سامنے حویلی کا ایک ایک دروازہ اور ایک ایک کھڑکی اندر سے بند کراتے ہیں — پہلے وہ کبھی ایسا نہیں کرتے تھے۔ بس ملازموں سے کہہ دیا کہ بھئی دروازے اور کھڑکیاں بند کر دو اور بس — لیکن اب تو وہ اپنے سامنے بند کراتے ہیں — ہے نا عجیب بات۔"

"عجیب سے بھی دو ہاتھ آگے۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"جی کیا کہا۔ عجیب سے بھی وہ اٹھ آگئے" خاور احمد نے حیران ہو کر کہا اور پھر بے ساختہ مسکرا دیا۔

"کیا میں نے غلط جملہ کہہ دیا۔ بات دراصل یہ ہے خاور صاحب کہ ــ" آفتاب کہتے کہتے رُک گیا۔

"بات دراصل یہ ہے خاور صاحب کہ اس دراصل کے بعد ان کی زبان ٹھپ ہو جاتی ہے" فرحت نے منہ بنایا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ہاں کسی قدر اُلجھن ضرور ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ بات دراصل یہ ہے خاور صاحب کہ میری اُردو ذرا کمزور ہے اور بعض اوقات میں عجیب و غریب جملے بول جاتا ہوں ـــــ اس لیے ذرا معاف ہی فرمایئے گا۔"

"لیکن میرے خیال میں آپ نے غلط نہیں کہا تھا ـــــ ہاں مجھے سُن کر حیرت ضرور ہوئی تھی۔"

"تب آپ اپنی حیرت کو کچھ سمجھائیں" آفتاب بولا۔

"حیرت کو سمجھاؤں" خاور احمد کے چہرے پر بلا کی حیرت نظر آئی۔

"خاور صاحب، بات دراصل یہ ہے کہ یہ حضرت بالکل اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ لہٰذا آپ ان کی باتوں پر ہرگز نہ جائیں" آصف نے برا سا منہ بنایا۔

"جی ہاں ــ بلکہ ان کی باتوں پر جائیں ـــــ" آفتاب بولا۔ خاور احمد مسکرا رہا تھا۔ موقع ملتے ہی اس نے کہا۔

"ڈیڈی نے ٹھیک ہی کہا تھا"

"جی کیا مطلب!" تینوں چونک اٹھے۔

"یہ کہ آپ تینوں کے ہوتے ہوئے وہ گھنٹے بہت آسانی سے گزر جائیں گے ـــــ آپ لوگ کرتے کیا ہیں!"

"جی خوب رہی ـــــ اس عمر میں بھلا ہم پڑھنے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں" آفتاب نے فوراً کہا۔

"بالکل غلط ــ ہم پڑھنے کے علاوہ جاسوسی بھی بگھارتے ہیں"

"جاسوسی ـــــ اوہ ہاں ـــــ ڈیڈی نے بتایا تھا کہ آپ انسپکٹر کامران مرزا کے بچے ہیں ـــــ دراصل میں ملک سے باہر رہا ہوں، ڈیڈی کے دوستوں سے زیادہ واقف نہیں ـــــ مجھے آئے ابھی چند ہی سال ہوئے ہیں"

"ہوں، اور آپ نے کیا کہا تھا ـــ آپ کے ڈیڈی کچھ وہمی اور پاگل ہو گئے ہیں" فرحت نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ـــ یہی کہا تھا، لیکن اُن کی صحت بہت شاندار ہے" خاور احمد نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی صحت شاندار نہ ہو" آصف کے لہجے میں حد درجہ حیرت تھی۔

"ہاں، اس عمر میں اتنی شاندار صحت کچھ اچھی نہیں لگتی" خاور احمد نے کہا اور وہ حیران رہ گئے۔ پھر آفتاب بولا:

"لیکن خان احمد صاحب اس عمر کے تو نظر نہیں آتے"

"اس فقرے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" خاور احمد نے اسے گھورا۔

"اس فقرے سے میرا وہی مطلب ہے جو آپ کا اس عمر کہنے سے تھا۔"
آفتاب نے اس کے گھورنے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ حضرت اوٹ پٹانگ باتیں
کرنے کے عادی ہیں۔" آصف بولا۔

"اوہ ہاں۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

وہ کچھ بھولا تھا یا نہیں۔ اتنا ضرور بھول گیا کہ دو گھنٹے کس طرح گزر
گئے۔ اس دوران خاور احمد بھی ان کے پاس واپس نہیں آئے۔ وہ تو اس
وقت چونکے، جب دروازے کی گھنٹی بجی۔

"شاید وکیل صاحب آ گئے۔" آصف کے منہ سے نکلا۔

"وکیل صاحب ابھی کہاں۔ وہ تو دو گھنٹے بعد آئیں گے۔"

"دو گھنٹے بعد ہی تو آئے ہیں خاور صاحب۔" آفتاب نے منہ بنایا اور
خاور احمد نے چونک کر گھڑی دیکھی۔

"ارے کمال ہے۔ یہ تو واقعی دو گھنٹے گزر گئے۔ حیرت ہے۔"
اس نے کہتے ہوئے کہا۔

اسی وقت ایک ملازم اندر داخل ہوا۔

"چھوٹے صاحب۔ وکیل [illegible] آئے ہیں۔" اس نے باادب ہو
کر کہا۔

"ٹھیک ہے شکور۔ انہیں مہمان خانے میں بٹھاؤ اور ڈیڈی کو اطلاع
کر دو۔ میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر خاور احمد پھر ان کے
پاس بیٹھ گئے۔

"جی بہتر۔" شکور نے کہا اور باہر نکل گیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔
چہرے پر ڈاڑھی اور باریک مونچھیں تھیں۔

"ایک طرف تو آپ نے کہا ہے کہ میں بھی وہاں پہنچ رہا ہوں اور
دوسری طرف آپ پھر بیٹھ گئے ہیں۔" آفتاب نے اس کے چہرے پر نظریں
جماتے ہوئے کہا۔

"دروازے سے مہمان خانے کا فاصلہ کم از کم ایک منٹ کا ہے۔ وکیل
صاحب مہمان خانے میں جا کر بیٹھ جائیں اور ڈیڈی بھی وہاں پہنچ جائیں۔ اس
کے بعد ہی وہاں جانے کا کوئی فائدہ ہے۔ اس سے پہلے میں وہاں
جا کر کیا کروں گا۔"

"بات تو معقول ہے۔" فرحت نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"کیا آپ میرا مذاق اڑانے کے موڈ میں ہیں۔" خاور احمد نے فوراً اس
کے انداز کو بھانپ لیا۔

"یہ بےچاری کیا کسی کا مذاق اڑائے گی۔ پتنگ تک اڑانا تو اسے
آتا نہیں۔" آفتاب نے فوراً دخل دیا۔

"بھلا مذاق اڑانے کا پتنگ اڑانے سے کیا تعلق۔" خاور احمد اس کی
طرف الٹ پڑا۔

"دونوں چیزیں اڑائی جاتی ہیں، یہ کچھ کم تعلق ——"

"بس —— ایک منٹ ہو چکا ہے —— میں جا رہا ہوں —— آپ لوگ اب آرام کریں، ملازم ابھی آکر آپ کا کمرہ دکھا دے گا —— آپ کے ساتھ وقت واقعی بہت تیزی سے اور دلچسپی کے عالم میں گزرا —— شکریہ"

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے نکل گیا، لیکن پھر فوراً ہی آصف چلا اٹھا۔

"ارے ارے —— خاور صاحب —— یہ آپ کی زنجیر یہاں پڑی ہے۔"

انہوں نے دیکھا، فرش پر وہ زنجیر گری پڑی تھی جو خاور اپنی انگلی پر گھما رہا تھا، شاید وہ انگلی پر زنجیر گھماتے رہنے کا عادی تھا —— آصف کی آواز سن کر خاور احمد جلدی سے مڑا، کمرے میں داخل ہوا اور جھک کر زنجیر اٹھاتے ہوئے بولا۔

"شکریہ جناب —— شاید آپ لوگوں کو معلوم نہیں کہ یہ زنجیر خاص سونے کی ہے، ورنہ شاید آپ ——" اس نے جملہ درمیان میں چھوڑ دیا اور کمرے سے نکلنے لگا —— تینوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔ آصف نے تلملا کر کہا۔

"ذرا ٹھہریے خاور صاحب —— کیا آپ مہمانوں سے ایسا ہی سلوک کرنے کے عادی ہیں —— ہم اسی وقت یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔"

"افسوس —— اب آپ لوگ صبح سے پہلے نہیں جا سکتے، اس حویلی کے دروازے جب رات کو ایک بار بند کرا دیے جاتے ہیں، تو پھر

صبح سے پہلے نہیں کھلتے —— صدر دروازہ بھی اس وقت تک وکیل صاحب کے لیے کھلا رکھا گیا ہوگا، ان کے آنے کے فوراً بعد وہ بھی بند کرا دیا گیا ہے —— اب وکیل صاحب بھی صبح سے پہلے نہیں جا سکیں گے —— ویسے اپنے خیال میں تو میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی —— ہو سکتا ہے آپ ضرورت سے زیادہ ایماندار واقع ہوئے ہوں، لیکن اگر آپ لوگوں کی کوئی سونے کی زنجیر اس طرح گر جاتی اور مجھے یہ معلوم ہوتا کہ زنجیر سونے کی ہے تو میں کبھی آپ کو آواز نہ دیتا اور زنجیر کو اٹھا کر جیب میں رکھ لیتا۔"

وہ جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

وہ حیران رہ گئے —— یہ کس قسم کا آدمی ہے۔ ابھی خاور احمد کمرے سے نکلا نہیں تھا کہ شکور دروازے پر نمودار ہوا اور بولا۔

"بڑے صاحب آپ چاروں کو بلا رہے ہیں۔"

"ہم چاروں کو —— کیوں، ہم چاروں کی کیا ضرورت ہے۔ مہمان خانے میں وکیل صاحب وصیت تحریر کریں گے، بھلا وہاں ان تینوں کی کیا ضرورت ہے۔" خاور احمد نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"بڑے صاحب کا حکم یہی ہے جناب، یہ تو وہی جانتے ہوں گے کہ وہاں ان کی کیا ضرورت ہے۔" شکور نے نرم لہجے میں کہا۔

"ہوں ٹھیک ہے، خیر دیکھا جائے گا، آئیے بھئی —— آپ تینوں بھی آئیے۔"

"شکریہ، ہمیں کوئی ضرورت نہیں وہاں جانے کی ——" آصف نے

ذرا مان گرگ۔

"یہ میرا نہیں، ڈیڈی کا حکم ہے ــــ آپ کو مہمان خانے تک چھوڑنا
پڑے گا۔ ان سے اجازت لے کر آپ بے شک لوٹ آئیے گا"۔

آخر انہیں بھی اٹھنا پڑا، خاور احمد کے ساتھ ایک طویل راہداری میں
چلنے کے بعد وہ ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کے دوسری
طرف پر صوفہ نما کرسیوں پر انہیں خان احمد کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر
کا آدمی بیٹھا نظر آیا۔ اس کی آنکھوں پر عینک تھی، رنگ سیاہی مائل تھا۔
آنکھوں میں بڑی چمک تھی۔

"آؤ بھئی آؤ ــــ خاور ــــ تم تو وکیل صاحب سے اچھی طرح واقف
ہی ہو ــــ آفتاب، آصف اور فرحت ــــ یہ بہادر علی خان وکیل ہیں، شہر
کے مشہور وکیل ــــ عام طور پر قتل کے کیس لیتے ہیں ــــ آج تک
انہوں نے کوئی مقدمہ نہیں ہارا اور وکیل صاحب ــــ آپ یہ سن کر ضرور
چونک اٹھیں گے کہ یہ تینوں انسپکٹر کامران مرزا کے بچے ہیں"۔

"ارے اچھا ــــ کیا واقعی ــــ" وکیل بہادر علی خان کے چہرے پر حیرت
کے بادل تیرتے نظر آئے۔

"جی ہاں! ان لوگوں کو میں نے آج خاص طور پر روک لیا تھا"۔
خان احمد بولے۔

"لیکن ڈیڈی ــــ ان لوگوں کی یہاں کیا ضرورت۔ یہاں تو آج وصیت نامہ
تحریر کیا جائے گا"۔ خاور احمد نے چلاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بھئی ــــ بعد میں گواہ ان کے دستخط کرائیں گے۔ اگر کامران مرزا رُک
گئے ہوتے تو ان کے دستخط کرا لیتے ــــ کیا تمہیں ان کی یہاں موجودگی پر
اعتراض ہے ــــ میرے خیال میں تو اعتراض نہیں ہونا چاہیئے ــــ یہ تو
بہت مخلص لوگ ہیں اور کام آنے والے بھی"۔

"جی ــــ ن ــــ نہیں ــــ بھلا مجھے کیوں کوئی اعتراض ہو گا"۔ خاور احمد
نے کہا اور ان سے آگے بڑھ گیا۔ تینوں کو اس پر حد درجے غصہ آیا، تاہم
غصے کو پی کر وہ بھی آگے بڑھے اور دائیں بائیں بچھی کرسیوں پر بیٹھ
گئے۔ خاور احمد ان سے پہلے وکیل صاحب کے ساتھ والی کرسی پر
بیٹھ چکے تھے۔

"ہاں تو بہادر علی خان صاحب ــــ کیا آپ وصیت نامہ تحریر کر لائے
ہیں ــــ"

"جی ہاں! آپ کی خواہش کے عین مطابق وصیت نامہ بالکل تیار ہے
بس آپ کے دستخطوں کی کمی ہے"۔

"ٹھیک ہے، وصیت نامہ پڑھ کر سنا دیجیے"۔ خان احمد بولے۔

"جی بہتر" ــــ وکیل نے کہا اور وصیت نامہ کھول کر پڑھنا شروع کیا:
"میں ہوش و حواس کی حالت میں یہ وصیت تحریر کر رہا ہوں
میری وفات، خواہ کسی طرح بھی واقع ہو، کے بعد میری
تمام نقد دولت میں سے چوتھائی حصہ کسی مسجد کی تعمیر پر لگا دیا
جائے اور بقیہ تین چوتھائی حصہ میرے بیٹے خاور احمد کو ملے

گا۔ زمینیں اور حویلی وغیرہ اس کی ہو گی۔ لیکن اس سے
پہلے اس میں سے گھر کے ملازموں کو دس دس ہزار روپے
ادا کیے جائیں گے۔ میرا بیٹا خاور احمد میری وفات کے فوراً
بعد ہی اپنے حصے کا پوری طرح مالک ہو گا اور اپنی مرضی
سے اسے خرچ کرنے یا کاروبار میں لگانے کا حق دار ہو
گا۔ وہ پوری طرح آزاد ہو گا۔

خان احمد۔

یہاں تک سُن کر وکیل بہادر علی خان خاموش ہو گیا۔ کمرے میں چند
لمحوں کی خاموشی طاری ہو گئی۔ آخر سب سے پہلے خاور احمد کی آواز
کمرے میں گونجی۔

"ڈیڈی — یہ آپ نے کیا کیا — ایک چوتھائی جائداد مسجد کے
لیے اور دس دس ہزار روپے ملازموں کے لیے — اس حویلی میں تو
پانچ ملازم ہیں — گویا پچاس ہزار یہ چلے گئے — اور جائداد کا ایک
چوتھائی حصہ مسجد کے لیے دے دیا جائے گا — آپ کو معلوم بھی ہے
ایک چوتھائی حصہ کتنے کے برابر ہو گا — کم از کم پچاس لاکھ کے برابر
پھر آخر مجھے کیا ملا؟"

"تقریباً ڈیڑھ کروڑ — اور زمینیں اور یہ حویلی۔" خان احمد نے کہا۔

"خیر — جیسے آپ کی مرضی — میں جانتا ہوں، آپ ان الفاظ کو تبدیل
نہیں کرائیں گے۔ ایک بار آپ جو فیصلہ کر لیتے ہیں، اسے کسی صورت

تبدیل نہیں کرتے۔" خاور احمد نے تلملاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"دیکھو بیٹا، مجھے آخرت کی بھی فکر ہے۔ مسجد جیسی چیزیں بنانا صدقہ
جاریہ ہے۔ آدمی کو مرنے کے بعد بھی ثواب ملتا رہتا ہے۔ دوسرے
یہ کہ میرے ملازم بھی پانچوں پرانے ہیں۔ انہوں نے میری خوب خدمت
کی ہے۔ اس لیے انہیں بھی کچھ نہ کچھ ملنا چاہیے — لائیے
وکیل صاحب میں دستخط کر دوں۔ گواہ کے طور پر یہ تینوں دستخط
کریں گے۔"

"بہت بہتر جناب!"

وکیل بہادر علی خان نے وصیت نامہ ان کے آگے کر دیا۔ انہوں نے
اپنا قلم جیب سے نکالا اور دستخط کر دیے۔ پھر وکیل وصیت نامہ
ان تینوں کے پاس لایا اور تینوں نے دستخط کر دیے۔ ابھی وہ دستخط
کر کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ خان احمد زور
سے چونکے۔ ان کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔

"یہ اس وقت کون آ گیا — میرے ہاں تو اس وقت کبھی کوئی
نہیں آیا۔ وکیل صاحب اس وصیت کو میری موت تک محفوظ رکھیے
گا — اب آپ آرام کرنے کے لیے جا سکتے ہیں۔ خاور تم بھی جاؤ۔
اور تم تینوں بھی — خاور — رحیم سے پوچھ لینا، ان لوگوں کے لیے کون
سا کمرہ تیار کیا ہے — اور انہیں اس کمرے میں پہنچا دیں۔"

"جی بہتر۔" خاور نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔ اس کا موڈ ابھی

تک خراب تھا۔ وہ اپنی زنجیر تیزی سے انگلی پر گھما رہا تھا۔

اور جب وہ کمرے سے نکل رہے تھے، انھوں نے شکور کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار تھے۔ وہ کچھ کہنے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن جب تک وہ کافی فاصلے پر نہیں پہنچ گئے، اس وقت تک شکور نے اُن سے کچھ نہیں کہا۔

تینوں نے اُس وقت شدید قسم کی بے چینی محسوس کی۔

ایک رات کے قیدی

"آپ تینوں یہاں ٹھہریں۔ میں گھوم کر دیکھتا ہوں، وہ کہاں ہے؟" خاور احمد نے ایک راہداری میں رُکتے ہوئے کہا۔

ابھی تک انہیں پوری حویلی دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لہٰذا یہ حویلی بھی ان کے لیے بھول بھلیاں بنی ہوئی تھی۔

"یار یہاں تو حالات کچھ پُر اسرار سے ہوتے جا رہے ہیں۔" ثمن نے آفتاب کی طرف دیکھ کر دبی آواز میں کہا۔

"ہاں! حالات نے ہماری صحبت کا اثر لے لیا ہے۔" آفتاب مسکرایا —

"خاور احمد جیسا عجیب بیٹا میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ اسے باپ سے زیادہ دولت کی فکر ہے اور باپ کے منہ پر ہی وہ ایسی باتیں کرتا ہے جیسے اسے باپ کے مرنے کا شدت سے انتظار ہو —

دوسری طرف خان احمد بھی عجیب ہیں جو ایسے بیٹے کو اپنی تین چوتھائی دولت اور ساری جائداد سونپ رہے ہیں — ان سب باتوں کے علاوہ

اب اس وقت کون آگیا ہے۔ خان احمد صاحب کا کہنا ہے کہ اس وقت اُن کے ہاں کبھی کوئی نہیں آیا — کیا خیال ہے — کیا ہمیں آنے والے کو دیکھنا چاہیے" آصف کہتا چلا گیا۔

"ہاں، ضرور — اس کے بغیر بھلا ہمیں نیند کس طرح آئے گی۔"
آفتاب نے منہ بنایا۔

"مجھے تو یہاں ڈر لگ رہا ہے" فرحت نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں؟ کیا یہاں جن بھوت نظر آ رہے ہیں" آفتاب نے اُسے گھورا —

"حویلی کی فضا عجیب سی ہے —"

"تو ہونے دو، ہم کیوں ڈریں" آصف نے کندھے اچکائے۔ اسی وقت ایک بوڑھا آدمی آتا نظر آیا۔ قریب آکر اُس نے کہا،

"میرا نام رحیم ہے اور میں اس گھر کا سب سے پُرانا ملازم ہوں، آئیے میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں"

"شکریہ!" تینوں نے ایک ساتھ کہا اور اس کے پیچھے چل پڑے۔

چند قدم کے فاصلے پر ہی وہ ایک کمرے کے دروازے پر رُک گیا اور اس کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا،

"یہ آپ کا کمرہ ہے، ضرورت کی ہر چیز اندر موجود ہے، تاہم کسی چیز کی کسی بھی وقت ضرورت پڑے، تو اندر آتش دان کے اوپر گھنٹی کا بٹن لگا ہے، اسے دبا کر آپ مجھے بلا سکتے ہیں — کیا اب میں

جا سکتا ہوں"

"جی ہاں، بہت بہت شکریہ!" آصف نے کہا اور رحیم چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی آفتاب نے کمرے کا دروازہ پھر بند کر دیا اور بولا،

"آؤ — پہلے آنے والے کو ایک نظر دیکھ لیں"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے — کمرہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں، جب جی چاہے گا، آرام کرنے کے لیے اس میں داخل ہو جائیں گے" آصف نے کہا اور صدر دروازے کی طرف قدم اٹھا دیے۔

"تو کیا تمہارے خیال میں آنے والا ابھی تک دروازے پر ہی موجود ہوگا — جب کہ اس نے کافی دیر پہلے دستک دی تھی" فرحت بولی۔

"ہم پہلے دروازہ ہی دیکھ سکتے ہیں، اس کے بعد مہمان خانے میں چلیں گے"

تینوں صدر دروازے کی طرف چل پڑے۔ لیکن وہاں پہنچ کر انہیں مایوسی ہوئی — صدر دروازہ بند تھا اور اس میں اندر کی طرف بڑا سا تالا لگ رہا تھا۔

"آخر نواب صاحب اتنے محتاط کیوں ہیں — کیا ان کے پاس نقدی کی صورت میں دولت گھر میں موجود رہتی ہے — کیا انہوں نے بینک میں حساب نہیں کھولا" آصف نے اُلجھ کر کہا۔

"ہو سکتا ہے، یہی بات ہو — کوئی اور بات بھی ہو سکتی ہے — آؤ، مہمان خانے کی طرف چلیں" آفتاب نے لاپروائی کے انداز

میں کہا —

تینوں اب پھر اس کمرے کی طرف جا رہے تھے، جس میں تھوڑی
دیر پہلے انہوں نے وصیت نامے پر دستخط کیے تھے — یہ کمرہ بھی
انہیں خالی ملا۔

"ارے — آخر یہ خان احمد صاحب کہاں چلے گئے اور وہ آنے
والا کہاں چلا گیا؟" آصف کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"کیوں نہ ہم خان احمد صاحب کے کمرے میں جھانک کر دیکھ لیں؟"

"یہ ٹھیک رہے گا، لیکن ہمیں کیا معلوم کہ اُن کا کمرہ کون سا ہے؟"

"یہ کام ہم رحیم سے لے سکتے ہیں — ہمیں اپنے کمرے میں جا
کر بس گھنٹی بجانا ہوگی۔ اس کے بعد رحیم ہمیں خان احمد کے کمرے
کے بارے میں بتا دے گا۔"

"تو پھر آؤ — جلدی کرو — کہیں آنے والا چلا نہ جائے اور ہم
اسے دیکھنے سے محروم رہ جائیں۔" یہ کہہ کر آفتاب اپنے کمرے کی
طرف مُڑ گیا۔

انہوں نے تیز تیز قدم اس طرح اٹھائے کہ ہلکی سی آہٹ بھی پیدا
نہ ہو سکی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر آصف نے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ انہوں
نے دیکھا، اس کمرے میں تین پُر تکلف بستر بچھا دیے گئے تھے اور کمرے
میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ یہاں تک کہ ایک الماری کھانے
پینے کی چیزوں سے بھری پڑی تھی۔ جلد ہی قدموں کی آواز سنائی دی اور

پھر رحیم کی صورت نظر آئی۔

"ہمیں افسوس ہے، ہم نے آپ کو پھر زحمت دی — دراصل ہم
ایک بات خان احمد صاحب سے کہنا بھول گئے ہیں اور انہوں نے
ہمیں ہر طرح اجازت دے رکھی ہے کہ جب جی چاہے، اُن کے
پاس جا سکتے ہیں، مہربانی فرما کر یہ بتا دیجیے کہ اُن کا کمرہ کون
سا ہے؟"

"جی بہتر — کمرے سے نکل آئیے —" اس نے کہا۔

تینوں اس کے ساتھ باہر نکلے — اور رحیم نے اشارہ کرتے ہوئے
کہا —

"اس راہداری میں سیدھے چلے جائیں اور آخر میں بائیں ہاتھ مُڑ
جائیے — مڑتے ہی دائیں ہاتھ تیسرا کمرہ اُنہی کا ہے — دوسرا کمرہ
ان کے بیٹے نادر احمد کا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ!" آفتاب نے جلدی سے کہا۔

رحیم واپس چلا گیا اور تینوں خان احمد کے کمرے کی طرف چل پڑے
راہداری کے آخر میں پہنچتے ہی انہوں نے دبے پاؤں چلنا شروع کر دیا
یہاں تک کہ بائیں طرف مڑ گئے — دوسرے کمرے کا دروازہ انہیں بند
ملا۔ تیسرے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا
راستے میں کوئی نہیں تھا؛ چنانچہ انہوں نے اپنے کان دروازے سے
لگا دیے — اندر باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لیکن بات

جیت ان کی سمجھ میں نہ آسکی — اب تو وہ بہت پریشان ہوئے اور
ابھی سوچ ہی رہے تھے، کیا کریں کہ قدموں کی چاپ ان کے کانوں
سے ٹکرائی — وہ فوراً واپس مڑے اور اس راہداری میں آگئے
جس سے ہو کر یہاں تک آئے تھے۔ پھر آصف نے راہداری کے موڑ
پر سر آگے جھکا کر دیکھا — اس نے دیکھا، دوسری طرف سے شکور
خان احمد کے کمرے کی طرف آرہا تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا
اور اندر داخل ہوگیا۔

"میرا خیال ہے، ہمیں جرأت سے کام لینا پڑے گا۔" اچانک آصف
نے کہا —

"کیسا کام — جرأت کی ہمارے پاس بھلا کیا کمی ہے۔" آفتاب چونکا۔
"اگر کمی نہیں ہے تو پھر آؤ۔" یہ کہہ کر آصف نے قدم بڑھائے۔
آفتاب نے بھی اس کا ساتھ دیا — لیکن فرحت اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔
"کیا ہوا، کیا تم اپنی جرأت گھر چھوڑ آئی ہو؟" آفتاب نے مذاق
اڑانے والے لہجے میں سرگوشی کی۔

"نہیں، میرے ساتھ ہی ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں اپنی عقل
بھی ساتھ لے آئی ہوں جبکہ تم دونوں ویسے ہی عقل سے کورے ہو۔"
"کیا کہنا چاہتی ہو؟" آصف جھنجھلا اٹھا۔

"یہ کہ — تم خان احمد کے کمرے میں بے دھڑک گھس جانے کا
پروگرام بنا چکے ہو، جب کہ تم نے یہ تک نہیں سوچا کہ اندر گھسنے کے

"پھر تم کہو گے کیا؟"
"بس — کچھ نہ کچھ تو کر ہی لیں گے، تم اس کی فکر نہ کرو۔"
"یہ زبان آخر کس دن کام آئے گی۔" آفتاب نے بُرا سا منہ بنا کر کہا اور
پھر ان دونوں کا انتظار کیے بغیر تیر کی طرح خان احمد کے دروازے کی طرف
چلا، یہاں تک کہ رکے بغیر دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہوگیا — آصف اور
فرحت کو بھی تیزی سے حرکت میں آنا پڑا، ورنہ آفتاب اور ان کے اندر
داخل ہونے میں کوئی وقفہ ہو جاتا۔

کمرے میں موجود لوگوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا، ادھر
انھوں نے دیکھا کہ اندر خان احمد اور شکور کے علاوہ تین آدمی اور موجود تھے،
ان تینوں کی شکل و صورت بدمعاشوں جیسی تھی۔ ان کے چہروں پر
بڑی بڑی مونچھیں تھیں، آنکھیں سرخ انگارہ سی تھیں۔ تینوں کے تینوں
ایک جیسے قد و قامت کے تھے۔ تینوں خان احمد کی مسہری کے سامنے
بچھی کمر دار کرسیوں پر تنے بیٹھے تھے، جبکہ خان احمد مسہری پر
بیٹھے تھے —

"خیر تو ہے آفتاب، آصف — تم کیسے آئے؟"
"وہ جی — جی وہ — بات دراصل یہ ہے کہ —" آفتاب ہکلانے لگا۔
آصف نے جلدی سے ایک قدم آگے بڑھایا اور بولا،
"جی ہاں — بات صرف اتنی سی ہے کہ ہم —" آصف بھی ہکلا کر
رہ گیا — فوری طور پر کوئی بات اسے بھی نہ سوجھ سکی — دراصل اندر

کی صورت حال نے دونوں کو بوکھلا دیا تھا۔

"میں بتاتی ہوں انکل — ہم تینوں دراصل اپنے گھر جانا چاہتے ہیں" فرحت کے مُنھ سے ان کی جان میں جان آئی۔

"جی بالکل یہی بات ہے" عصمت جلدی سے بولا۔

"لیکن کیوں — تمہیں ایسی کیا ضرورت آ پڑی — تمہیں تو رات یہیں گزارنا ہے اور صبح ناشتا کر کے انسپکٹر کامران مرزا کے ساتھ جانا ہے — کیوں — یہی طے ہوا تھا نا؟"

"جی ہاں — طے تو یہی ہوا تھا، لیکن انکل — اب ہم یہاں رک نہیں سکتے" عصمت بولا۔

"لیکن کیوں — آخر ہوا کیا ہے — کیا کمرہ پسند نہیں آیا؟"

"جی نہیں — یہ بات نہیں — کمرہ تو بہت زیادہ اچھا ہے — اتنا کہ ہم ایک رات کی بجائے دس راتیں اس میں سو سکتے ہیں، لیکن بات صرف اتنی سی ہے کہ —" آفتاب کی گاڑی پھر اٹک گئی۔

"ہاں — ہاں — بتاؤ نا — بات صرف کتنی سی ہے" خان احمد بولے —

"جی میں بتاتی ہوں — بات صرف اتنی سی ہے کہ ہمارا یہاں ٹھہرنا خاور احمد صاحب کو پسند نہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ کسی کو ناگوار گزریں —"

"اوہ — تم خاور کی بات کرتی ہو — اس گھر کا مالک میں ہوں

جب تک میری زندگی ہے — میں ہر چیز کا مالک ہوں — میں اس کے کان اگر کہو تو ابھی بلا کر کھینچوں، ورنہ صبح ناشتے کے وقت کھینچوں گا — بیٹا، یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ اس وقت سو چکا ہوگا — دراصل وہ بہت جلد سو جانے کا عادی ہے اور نیند بھی اسے ایسی گہری آتی ہے کہ کیا بتاؤں — اس کے کانوں کے پاس کوئی ڈھول بھی پیٹے تو بھی اس کی آنکھ نہیں کھلتی —"

"شکریہ انکل — ہمیں کان کھنچوانے کا کوئی شوق نہیں" آفتاب نے منھ بنایا۔

"تو پھر جاؤ — اور آرام کرو — تم اس گھر کے معزز مہمان ہو، صبح میں خاور کو بھی سمجھاؤں گا۔"

"جی بہتر — جیسے آپ کی مرضی" فرحت نے مایوسانہ انداز میں کہا، اور تینوں دروازے کی طرف مڑتے ہوئے باہر نکل آئے — ساتھ ہی انھوں نے خان احمد کو کہتے سُنا:

"شکور، تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو — جاؤ — جا کر چائے لے آؤ —"

"جی بہتر —" شکور بولا۔

اور جب وہ باہر نکل کر مڑے تو شکور باہر نکل رہا تھا — کھلے دروازے میں سے انھوں نے تین نقاب پوش صورت آدمیوں میں سے ایک کو کہتے سُنا،

"یہ تینوں کون ہیں؟"

"یہ — یہ میرے ایک دوست کے بچے ہیں۔"

"یہ تو کچھ خطرناک سے دکھائی دیتے ہیں۔"

"ارے نہیں — یہ تو بہت شریف ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی شکور نے دروازہ بند کر دیا اور ان پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پاس سے گزرنے لگا۔

"شکور میاں — کیا ہمیں بھی چائے مل سکتی ہے؟"

"آپ چائے کے لیے رحیم سے کہیں — میں صرف اور صرف خان احمد صاحب کا کام کرتا ہوں۔ رحیم مہمانوں کے لیے ہے اور کریم چھوٹے صاحب کے کام کرتا ہے —"

"اور باقی دو کیا کرتے ہیں، کیونکہ ہم نے سُنا ہے، یہاں پانچ آدمی ملازم ہیں۔"

"جی ہاں — منظور اور صابر مالی ہیں۔ وہ صرف باغ کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ان کا حویلی کے اندرونی معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔"

"بہت اچھا۔ چلو بھئی۔ ہم رحیم سے کہے دیتے ہیں۔"

تینوں اُٹھے اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔

"کیا خیال ہے" آصف گنگنایا۔

"ٹھیک خیال ہے — چائے ضرور پی جائے گی" آفتاب نے فوراً کہا۔

"لا حول ولا قوۃ — میں چائے کی بات نہیں کر رہا — ان تینوں کے

بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

"ہاں — وہ تینوں — ایک نمبر کے غنڈے دکھائی دیتے ہیں۔"

"اوہو — بھئی میرا مطلب ہے — ان ایک نمبر کے غنڈوں کا اصل خان احمد سے کیا تعلق؟"

"بھئی — کوئی نہ کوئی تو تعلق ہو گا ہی۔ ہو سکتا ہے — خان احمد کے دور پار کے رشتے دار ہوں" آفتاب نے جواب دیا۔

"تم سے بات کرنا ہی فضول ہے — فرحت تم کیا کہتی ہو؟"

آصف ہٹ کر فرحت کی طرف مڑا۔

"اگر بات کرنا فضول ہے تو پھر کیوں کرتے ہو — کتنے فضول ہو تم" آفتاب نے جل بھن کر کہا۔

"یار کان نہ کھاؤ، میں فرحت سے بات کر رہا ہوں۔"

"مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے" فرحت بولی۔

"لو اور کرو فرحت سے بات — اب ڈھونڈو — دال میں کالا کہاں ہے —"

"ٹھیک ہے — ہم ان تینوں کی نگرانی کریں گے — کہیں یہ کسی خطرناک ارادے سے نہ آئے ہوں۔ خان احمد کچھ خوف زدہ اور پریشان تو دکھائی دیتے تھے" آصف نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اب ہم اپنے کمرے کی طرف کیوں جا رہے ہیں — ہمیں تو راہداری کے موڑ پر ہی رہنا چاہیے — ابھی تھوڑی دیر تک شکور چائے لے

کر آتے گا۔ دروازہ ایک بار پھر کھلے گا۔ شاید اُس وقت کوئی اور بات معلوم ہو جائے۔"

"بات تو ٹھیک ہے — تو پھر واپس چلیں۔"

"تم جاؤ واپس — میں تو اب اپنے کمرے میں جا کر آرام کروں گا۔" آفتاب نے گردن کو جھٹکا دیا۔

"ضرور جاؤ۔ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت بھی نہیں —" فرحت نے ہاتھ نچایا۔

"بالکل ٹھیک ہے — ہم تمہارے بغیر ہی بھلے۔" آصف نے بھی فوراً کہا —

آفتاب نے دونوں کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔

دونوں واپس مڑے اور موڑ پر پہنچ کر رک گئے۔ انہیں چند منٹ بعد ہی شکور آتا نظر آیا۔ وہ چائے کی ٹرالی دھکیلتا چلا آ رہا تھا، پھر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کمرے میں داخل ہو گیا — دونوں پھر خان احمد کے دروازے کے پاس سرک آئے۔ انہوں نے انہیں کہتے سنا —

"ٹھیک ہے شکور — چائے ہم پی لیں گے — تم جا کر ان کے لیے تین کمرے ٹھیک کر آؤ — آپ تینوں الگ الگ کمرے میں سونا پسند کریں گے؟"

"جی — جی ہاں — الگ الگ کمرہ ہی ٹھیک رہے گا۔" اُن میں سے ایک نے کہا۔

"جی بہتر — میں ابھی جا کر ٹھیک کیے دیتا ہوں۔" شکور نے کہا اور دروازے کی طرف مڑا — آصف اور فرحت کو پھر پیچھے ہٹنا پڑا اور جب وہ چلا گیا تو دونوں پھر دروازے پر آ گئے — اور کان لگا دیے — گفتگو دبی آواز میں ہو رہی تھی۔ لہٰذا ان کے پلے کچھ نہ پڑا۔ تاہم دونوں صبر کیے کھڑے رہے — اچانک انہوں نے ان تین میں سے ایک کی آواز بلند ہوتے سُنی:

"بس جناب — یہ ہمارا آخری مطالبہ ہے — ہم اس سے کم نہیں کریں گے۔"

"ہاں — لیکن — یہ بہت زیادہ ہے۔"

"اور یہ راز کتنا بڑا ہے۔ یہ بھی تو سوچیے۔" آواز اور بلند ہو گئی۔

"خیر — اس وقت تو آپ آرام کریں — صبح دیکھا جائے گا۔" خان احمد بولے۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" ان میں سے ایک بولا۔

اور پھر خاموشی چھا گئی — تھوڑی دیر بعد شکور کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ پھر پیچھے ہٹ گئے — چند منٹ بعد شکور ان تینوں کو لے کر باہر نکل رہا تھا۔ اُن کے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"اب کیا کریں؟"

"آؤ... ایک بار پھر خان احمد کے کمرے میں چلیں۔" فرحت بولی۔

"لیکن اب وہاں جا کر کیا کریں گے؟" آصف اُلجھ کر بولا۔

"تم آؤ تو سہی..." یہ کہہ کر فرحت آگے بڑھی اور دروازے پر دستک دی۔

"اب کون آگیا؟" اندر سے خان احمد کی آواز سنائی دی۔

"انکل... یہ ہم ہیں۔" آصف جلدی سے بولا۔

"آجاؤ بھئی... دروازہ کھلا ہے۔" وہ بولے اور دونوں اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے دیکھا، خان احمد اب بستر پر پوری طرح لیٹ چکے تھے... گویا سونے کی تیاری کر چکے تھے۔

"آفتاب تمہارے ساتھ نظر نہیں آرہا؟" خان احمد نے ان پر نظر پڑتے ہی کہا۔

"وہ ایک ضرورت کے تحت کمرے میں ہی ٹھہر گیا ہے۔" آصف نے جلدی سے کہا۔

"اب کیسے آئے؟"

"ان تینوں کے بارے میں معلوم کرنے... یہ تینوں آخر کون ہیں۔ آپ سے ان کا کیا تعلق ہے اور یہ آپ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" خان احمد نے فکر مندانہ انداز میں کہا۔

"اس لیے کہ وہ تینوں شکل صورت سے کچھ اچھے آدمی دکھائی نہیں

دیتے۔" فرحت نے فوراً کہا۔

"نہیں، تم فکر نہ کرو... تینوں بہت اچھے آدمی ہیں، دراصل یہ میری زمینوں پر کام کرتے ہیں... تنخواہوں میں اضافے کی بات کرنے آئے ہیں۔"

"تنخواہ میں اضافے کے لیے آئے ہیں؟" آصف کے منہ سے نکلا اور اسے وہ جملے یاد آگئے جو اس کمرے کے دروازے سے لگ کر سنے تھے۔ وہ تینوں کوئی مطالبہ ضرور کر رہے تھے اور خان احمد ان کا مطالبہ کسی حد تک مان بھی رہے تھے... لیکن آصف اور فرحت کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ ان تینوں کا لہجہ ایسا نہیں تھا جیسے ملازم لوگوں کا اپنے مالک سے بات کرتے ہوئے ہوتا ہے۔

"تو کیا آپ نے اُن کا مطالبہ مان لیا ہے؟" آصف نے پوچھا۔

"ہاں بھئی... بس یوں سمجھو کہ زیادہ تر مطالبہ تو مان ہی لیا ہے۔" خان احمد نے کہا۔

"تو کیا صبح یہ تینوں چلے جائیں گے؟" فرحت بولی۔

"ہاں بالکل۔" انہوں نے کہا۔

"شکریہ انکل! ہم انہی کی طرف سے فکر مند تھے، اس لیے آپ کو ایک بار پھر زحمت دینے چلے آئے، اُمید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔" آصف نے واپسی کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں..." خان احمد بولے۔

"کیا آپ سوتے وقت کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں کرتے؟"

"ہاں، بند کرتا ہوں — ابھی شکور ایک بار اور آئے گا — میں سوتے وقت ایک کپ چائے پینے کا عادی ہوں۔ چائے کا کپ پی کر ہی سوؤں گا۔"

"تو مہربانی فرما کر دروازہ اندر سے بند کرنا نہ بھولیے گا۔" فرحت نے کہا —

"کیوں — کیا کوئی خطرہ ہے؟" خان احمد نے پریشان ہو کر کہا۔

"احتیاط اچھا ہے۔" فرحت بولی۔

"ہوں — تم فکر نہ کرو، شکور چائے کا کپ رکھ کر جونہی جائے گا، میں اُٹھ کر دروازہ بند کر دوں گا۔"

"شکریہ انکل — ایک بات اور — کیا اس دُنیا میں آپ کا کوئی اور عزیز زندہ نہیں ہے؟" فرحت نے ان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں، تم نے یہ سوال کیوں پوچھا — کچھ رشتے دار موجود تو ہیں، لیکن میرا ان سے ملنا جلنا نہیں ہے، مدتوں سے میں نے انہیں نہیں دیکھا۔" انہوں نے بتایا۔

"آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ وہ حضرات کہاں رہتے ہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں، میری پرانی ڈائریوں میں سے چند ایک میں ان کے نام اور پتے ہیں مگر تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟" خان احمد کے لہجے میں

حیرت تھی۔

"میں سوچ رہی تھی کہ کہیں وہ رشتے دار آپ کے وصیت نامے کے خلاف مقدمہ نہ کر دیں۔"

"اوہ، تم فکر نہ کرو، میں نے وکیل سے پہلے ہی مشورہ کر لیا ہے اب وہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔" وہ بولے۔

"پھر آپ مطمئن ہیں پھر ٹھیک ہے — آؤ آصف چلیں — اچھا انکل خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" اُن کے منہ سے نکلا۔

وہ کمرے سے باہر نکلے۔ انہوں نے دوسری طرف سے شکور کو چائے کا کپ اُٹھائے آتے دیکھا۔ انہیں کمرے سے نکلتے دیکھ کر شکور نے حیرت زدہ انداز میں آنکھیں جھپکائیں — لیکن منہ سے کچھ نہ بولا اور ان کے دروازے کے پاس سے ہٹنے کے بعد اندر داخل ہو گیا —

"شکور کا رویہ بھی کچھ عجیب سا لگتا ہے۔" فرحت بڑبڑائی۔

"اور یہ آفتاب بھی تو کچھ کم عجیب نہیں لگتا — آؤ — دیکھیں، وہ کیا کر رہا ہے۔"

"چلو۔" فرحت نے کہا۔

ابھی تک وہ خان احمد کے کمرے کے سامنے ہی کھڑے تھے — انہوں نے چلنے کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ قدموں کی چاپ سنائی

دی ـــ دروازہ کھلا اور شکور باہر نکلا۔ پھر چٹخنی لگنے کی آواز سنائی
دی۔ شکور انہیں وہاں کھڑے دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔
"خیر تو ہے جناب ـــ آپ لوگ ابھی تک یہاں کھڑے ہیں؟"
"اور کیا کریں ـــ رات تو کسی نہ کسی طرح بسر کرنا ہے۔"
آصف مسکرایا۔
"تو اپنے کمرے میں جا کر آرام کیجیے نا۔" اُس نے منہ بنایا۔
"اس حالت میں ہم بے چارے کیا آرام کریں گے۔" آصف نے
سرد آہ بھری۔
"کس حالت میں ـــ کیا یہاں کے حالات آپ کو خراب نظر آ
رہے ہیں ـــ لیکن یہاں تو کسی گڑبڑ کے دور دور تک آثار نہیں۔"
اُس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"آپ غلط سمجھے ـــ ہم ایسے مکان میں سونے کے عادی نہیں، جس
کے دروازوں پر اندر کی طرف بھی تالے لگا دیے جاتے ہوں ـــ اب
دیکھیے نا ـــ ہم یہاں خود کو ایک رات کے قیدی محسوس کر رہے ہیں۔"
"ارے نہیں ـــ ایسی بھی کیا بات ہے ـــ یہ تو صرف حفاظت کے
لیے کیا جاتا ہے۔"
"کیا خان احمد صاحب بہت زیادہ نقدی اپنی تجوری میں رکھنے
کے عادی ہیں؟"
"نقدی تو خیر نہیں ـــ ان کی تجوری میں البتہ زیورات اور ہیرے

بہت بڑی تعداد میں ہیں۔"
"تو یہ انہیں بینک میں کیوں نہیں رکھوا دیتے۔"
"اس سوال کا جواب تو خان احمد صاحب ہی دے سکتے ہیں۔"
"یہ تالے لگنے کا اصول یہاں کب سے چل رہا ہے؟"
"جب سے میں اس حویلی میں ملازم کی حیثیت سے آیا ہوں ـــ
اس وقت بھی اسی طرح تالے لگائے جاتے تھے۔" اُس نے بتایا۔
"گویا آپ کے آنے سے پہلے بھی یہاں تالے لگائے جاتے تھے؟"
"ہاں!" اُس نے کہا۔
"آؤ بھئی ـــ اب چل کر ذرا آرام کر ہی لیا جائے ـــ ساری رات تو
ہم جاگنے سے رہے۔" فرحت نے کہا اور دونوں اپنے کمرے کی طرف
مڑ گئے۔ شکور اسی سمت میں چلا گیا جس سمت سے آیا تھا۔
دونوں جب اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر انہیں حیرت
ہوئی ـــ آفتاب کمرے میں نہیں تھا۔
"ارے! یہ حضرت کہاں چلے گئے!" آصف کے منہ سے نکلا۔
"کم از کم کوٹھی سے باہر تو جا نہیں سکتے۔" فرحت مسکرائی۔
"اور پوری کوٹھی کے اندر ہم اسے تلاش نہیں کر سکتے ـــ لہٰذا کیوں
نہ بستروں پر لیٹا جائے۔" آصف نے اندر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے
کہا۔
"پاگل ہوئے ہو ـــ آج رات بھلا ہم کس طرح سو سکتے ہیں ـــ

حالات حد درجے پُر اسرار گم رہے ہیں — اس احمق کو بھی اسی وقت گم ہونا تھا —" فرحت نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"پاگل تو تم نے مجھے کہا — اور احمق شاید آفتاب کو — لیکن تو بتاؤ — تم خود کیا ہو؟" آصف نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

"میں — میں فرحت ہوں — تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم؟" فرحت مسکر

"تو اب تم آفتاب کی کمی کیوں محسوس کر رہی ہو؟"

"اس کی باتیں ہر قسم کے حالات میں ایک شاندار سہارا ہیں؟"

"اچھا — تو پھر اس سے جھگڑنے کی کیا ضرورت تھی؟" آصف نے بھنّاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں جھگڑی تھی — دماغ تو نہیں چل گیا — تم نے اس سے جھگڑا شروع کیا تھا؟" فرحت نے آنکھیں نکالیں۔

"مت جھگڑو — میں نے خود ہی خود سے جھگڑا شروع کر دیا تھا؟"

آفتاب کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی — انہوں نے دیکھا، وہ کمرے میں داخل ہو رہا تھا، اس کے چہرے پر ایک شوخ مسکراہٹ تھ

خوفناک مطلب

"کہاں چلے گئے تھے تم؟" آصف نے بھنّا کر پوچھا۔

"تم تو اس طرح پوچھ رہے ہو جیسے مجھے اس کمرے کی نگرانی پر مقرر کر گئے تھے؟" آفتاب نے کندھے اچکائے۔

"ائیں — تو کیا نہیں کر گئے تھے مقرر؟" فرحت نے مذاق اُڑایا۔

"نہیں، میں آزاد رہنا پسند کرتا ہوں — آزاد فضا میں سانس لینے کا عادی ہوں؟" آفتاب نے سینہ پُھلا کر کہا۔

"لیکن آج رات تم آزاد نہیں کہلا سکتے — ہم اس حویلی میں ایک رات کے قیدی ہیں؟"

"اگر یہ بات ہے تو پھر میں یہاں نہیں ٹھہروں گا؟" اُس نے پیر پٹخے —

"لیکن اب خان احمد سونے کے لیے لیٹ چکے ہیں اور حویلی کے دروازوں پر جو تالے لگے ہیں، ان کی چابیاں صرف انہی کے پاس ہیں جو صبح سے پہلے نہیں مل سکیں گے؟"

"لاحول ولا قوۃ" آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا

"تم نے بتایا نہیں — تم کہاں تھے"

"انہی تینوں کی باتیں سننے کے چکر میں تھا" آفتاب بولا۔

"تو پھر کوئی کامیابی ہوئی"

"اور کیا — میں کسی مہم پر جاؤں اور کامیابی نہ ہو" آفتاب اکڑ کر بولا —

"اچھا — چلو جلدی بتاؤ — تم نے کیا سُنا ہے؟"

"ان لوگوں نے خان احمد سے بیس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا ہے — صرف بیس لاکھ کا — جب کہ وہ انہیں دس لاکھ روپے دینے کے لیے تیار ہیں — فیصلہ صبح ہوگا"

"بیس لاکھ روپے کا مطالبہ" آصف نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"ہاں — کیا تم کچھ نہیں سن سکے" آفتاب نے پوچھا۔

"صرف اتنا کہ وہ تینوں خان احمد سے کچھ مطالبہ کر رہے تھے اور وہ ان کا مطالبہ کسی حد تک مان رہے تھے — تاہم دونوں فریقوں میں فیصلہ نہیں ہو سکا — بات صبح پر اٹھا دی گئی — اب تم بتا رہے ہو کہ انہوں نے بیس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا ہے — اور خان احمد نے دس لاکھ روپے دینے منظور کیے ہیں — حیرت ہے — آخر ان تینوں کا خان احمد پر کیا دباؤ ہے — وہ کیوں انہیں دس لاکھ روپے دینے پر تیار ہو گئے ہیں"

"یہ تو وہی بتا سکتے ہیں — میں نے تو جو سنا تھا، بتا دیا" آفتاب ہنس کر کہا —

"چلو خیر — تم نے کچھ کام تو کیا — اس کا مطلب ہے خان احمد سے جھوٹ بول رہے تھے، انہوں نے تو کہا تھا کہ یہ تینوں ان کی زمینوں پر کام کرتے ہیں اور تنخواہوں میں اضافے کے لیے آئے ہیں —"

"یہ تو خیر انہوں نے بے پر کی اڑائی ہے" آفتاب ہنسا۔

"خیر — خان احمد ہماری آنکھوں کے سامنے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر چکے ہیں — اور ان کے کمرے میں اندر داخل ہونے کا اور کوئی راستہ نہیں — لہٰذا ہمیں بھی اب آرام کرنا چاہیے — رات بھر جاگنے کی بھلا کیا ضرورت ہے"

"ٹھیک ہے — ہمیں کوئی اعتراض نہیں"

تینوں سونے کے لیے لیٹ گئے، لیکن نیند تو آنکھوں سے کوسوں دور تھی — رہ رہ کر انہیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ حویلی کے حالات عجیب غریب اور پُراسرار سے ہیں — کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے — لیکن بظاہر حویلی میں حالات بالکل پُرسکون تھے، کسی گڑبڑ کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا — ان حالات میں وہ کر ہی کیا سکتے تھے — اور آخر خیالات کے ہجوم میں سے نہ جانے کس طرف سے نکل کر نیند ان تک پہنچ ہی گئی — اور وہ اس کی آغوش میں چلے گئے۔

صبح رحیم نے انہیں جگایا، دیر سے سونے کی وجہ سے اُن کی آنکھ اپنے وقت پر نہیں کھلی تھی۔

"ہمارے ہاں ٹھیک آٹھ بجے ناشتا کیا جاتا ہے۔ خان احمد صاحب سب کو ناشتے کی میز پر موجود دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس وقت ساڑھے پانچ بجے ہیں۔ تیار ہونے کے لیے آپ کے پاس اڑھائی گھنٹے ہیں"

یہ کہہ کر رحیم واپس مُڑا اور کمرے سے جانے لگا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ بابا کہ آپ نے ہمیں نماز کے وقت اُٹھا دیا — باقی رہا — آٹھ بجے تک تیار ہونے کا معاملہ — تو ہم اس سے بہت پہلے تیار ہو جائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں"

"اچھی بات ہے"

انہوں نے نماز پڑھی اور پھر ناشتے کی میز پر جانے کے لیے تیار ہونے لگے — ٹھیک ایک گھنٹے بعد دروازے کی گھنٹی بجی — انہوں نے گھڑیوں کی طرف دیکھا — سات بج رہے تھے۔ گھنٹی بجانے کا انداز انسپکٹر کامران مرزا کا تھا۔

"ابا جان آ گئے — تو انہیں لینے دروازے تک چلیں" آفتاب اُچھل پڑا —

"چلو" آصف اور فرحت نے ایک ساتھ کہا۔

تینوں باہر نکل کر صدر دروازے کی طرف چل پڑے۔ اُدھر سے شکور آ رہا تھا۔

"کیا دروازہ کھولا جا چکا ہے"

"جی نہیں — خان احمد صاحب روزانہ صبح پانچ بجے اُٹھنے کے عادی ہیں۔ اُٹھنے کے بعد وہ سب سے پہلے مجھے بلا کر چابیاں دیا کرتے ہیں اور میں دروازے اور کھڑکیاں کھولا کرتا ہوں — لیکن آج پانچ بجے سے انتظار کرتے کرتے یہ وقت آ گیا ہے۔ انہوں نے اب تک گھنٹی نہیں بجائی —" شکور جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

"لیکن اب جب کہ باہر ہمارے ابا جان آ کھڑے ہوئے ہیں، ان سے چابیاں لانا ہی ہوں گی۔ خان احمد صاحب بھی رات بہت دیر سے سوئے تھے۔ شاید اسی وجہ سے ابھی تک اُن کی آنکھ نہیں کھلی — ہو نہ ہو آپ اُن کے دروازے پر دستک دیں گے، وہ فوراً جاگ جائیں گے"

"نہیں صاحب — مجھ میں اتنی ہمت نہیں — آج تک انہیں کبھی نہیں جگایا —"

"تو کیا ہمارے ابا جان باہر ہی کھڑے رہیں گے" آفتاب نے آنکھیں نکالیں —

"میں کیا کہہ سکتا ہوں" شکور نے بے چارگی کے عالم میں کندھے اچکائے

"اچھا کچھ نہیں کہہ سکتے تو پھر اپنی زبان بند ہی رکھنا — ہم خود ہی انہیں جگا لیتے ہیں"

یہ کہہ کر آفتاب، خان احمد کے کمرے کی طرف چل پڑا —

آصف اور فرحت نے اس کا ساتھ دیا — شکور بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔
دروازے پر پہنچ کر آفتاب نے دستک دی — کوئی جواب نہ ملا۔
چند سیکنڈ بعد اس نے پھر ہاتھ دو مرتبہ دروازے پر مارا — لیکن
اب بھی کچھ نہ بنا — اب تو آفتاب نے بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا
زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ ساتھ ہی چلا کر بولا۔

"خان احمد صاحب اٹھیے — سات بج رہے ہیں — آپ کے دوست
انسپکٹر کامران مرزا بھی دروازے پر کھڑے ہیں۔"

لیکن آفتاب کی یہ چیخ و پکار بھی بے کار گئی — انھوں نے بوکھلا کر
ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر شکور بے قرار ہو کر آگے بڑھا اور
دونوں ہاتھوں سے دروازہ دھڑ دھڑا ڈالا — لیکن خان احمد کے کان پر
تو اب بھی جوں نہیں رینگی۔ تینوں کی سٹی گم ہو گئی۔ آفتاب نے ان
دونوں سے کہا۔

"تم میرے ساتھ آؤ — شکور تم برابر دروازہ دھڑ دھڑاتے رہو —
ضرور کوئی گڑبڑ ہے —"

یہ کہہ کر وہ ان دونوں کے ساتھ صدر دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔
ان کے دوڑتے قدموں نے حویلی میں گونج پیدا کر دی۔ کسی طرف سے
غفور احمد نکل کر ان کے سامنے آ گیا اور چیخ کر بولا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے —"

"اپنے ڈیڈی کی خبر لیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کیا بدتمیزی

ہے۔" آصف نے جھنجھلا کر کہا۔

تینوں بدستور دوڑتے ہوئے صدر دروازے پر پہنچے — پھر آفتاب نے
صدر دروازے کے درمیان منہ لگا کر بلند آواز میں کہا۔

"اباجان! کیا آپ باہر موجود ہیں؟"

"ہاں بھئی موجود تو ضرور ہوں اور نہ جانے کب تک موجود رہنا پڑے
گا۔ میں نے غلطی کی — مجھے تو یہاں ٹھیک آٹھ بجے پہنچنا چاہیے تھا۔"

"بات یہ ہے اباجان کہ خان احمد صاحب اپنے کمرے کے اندر نہ
جانے کس حالت میں موجود ہیں۔ وہ دروازہ نہیں کھول رہے ہیں — ان
کے کمرے کا دروازہ بدستور دھڑ دھڑایا جا رہا ہے — صدر دروازے
اور دوسرے دروازوں کی چابیوں کا گچھا بھی ان کے کمرے میں ہی موجود
ہے —"

"ہوں! میرے جانے کے بعد یہاں کوئی خاص واقعہ تو رونما نہیں
ہوا تھا —"

"جی نہیں — البتہ خان احمد کے تین مہمان ضرور آئے تھے — ان
مہمانوں نے بھی رات یہیں گزاری ہے۔ تینوں مہمان شکل صورت سے
اوّل نمبر کے غنڈے جان پڑتے ہیں۔"

"ہوں — اگر خان احمد دروازہ نہیں کھولتے تو پھر دروازہ توڑنے کی
کوشش شروع کراؤ — میں باہر ہی ٹھہرنے کے سوا کیا کر سکتا ہوں —
کیونکہ اس حویلی کے اندر داخل ہونے کے تمام راستے بند ہیں۔ ہاں آتا

ضرور کر سکتا ہوں کہ آس پاس سے ڈاکٹر کو فون کر دوں — محلے کے تھانیدار کو فون کر دوں۔"

"جی ہاں — یہ کام ضرور کیجیے — کیونکہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ تو ضرور ہے — اچھا تو پھر ہم دروازہ توڑواتے ہیں۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔"

تینوں واپس پلٹے اور خان احمد کے دروازے پر پہنچے — اب یہاں حویلی میں موجود تمام آدمی پہنچ چکے تھے — البتہ ملازم صرف تین ہی نظر آئے — مالی شاید حویلی کے اندر نہیں سوتے تھے — وہ باہر یا اپنے گھروں میں سوتے ہوں گے۔

"کیا اب تک انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا؟" آصف نے پوچھا۔

"نہیں!" ان تینوں کے منہ سے نکلا۔

"تب پھر — دروازہ توڑنے کی کوشش کی جائے۔ دیر کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوگا۔" آصف بولا۔

"ہاں — یہی کرنا چاہیے۔" خاور احمد نے ہکلاتی ہوئی آواز میں کہا۔

تینوں ملازم ادھیڑ عمر کے تھے — ان سے تو دروازے کا کچھ نہ بگڑا — خاور احمد یوں بھی پتلا دبلا نوجوان تھا — آخر آفتاب نے تینوں مہمانوں سے درخواست کی — وہ آگے بڑھے اور اپنے کندھوں سے باری باری ٹکریں مارنے لگے۔

"بابا شکور — خان احمد چابیوں کا گچھا کہاں رکھتے ہیں؟" آفتاب نے

پوچھا۔ اُسے بار بار یہ خیال ستا رہا تھا کہ اس کے والد باہر کمرے میں تھا وہ چاہتا تھا۔ دروازہ ٹوٹنے کے بعد سب سے پہلے اندر داخل ہو کر چابیاں حاصل کرے اور جا کر صدر دروازہ کھول دے — پھر آ کر یہ دیکھے کہ کمرے میں کیا معاملہ ہے۔

"ان کے سرہانے کے نیچے ہوتا ہے۔" شکور بولا۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا — رحیم اور کریم بھی کچھ کم پریشان نہیں تھے — لیکن شکور کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔

"شکور میاں — اپنے آپ کو سنبھالو — تمہاری تو حالت بالکل ہی غیر ہوئی جا رہی ہے۔"

"م — میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔" اس نے روتی آواز میں کہا۔

"حوصلہ رکھو — شاید اندر کوئی گڑبڑ بھی نہ ہو اور خان احمد —"

اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے — اسی وقت دھڑام کی آواز سنائی دی تھی — انہوں نے دیکھا، دروازہ اکھڑ کر دوسری طرف جا گرا تھا — اور پھر وہ اندھا دھند اندر گھس پڑے — فوراً ہی اُن کے قدم رُک گئے — کیونکہ کمرے میں مکمل طور پر سکون تھا — کہیں کسی گڑبڑ کے آثار نہیں تھے۔ خان احمد اپنے بستر پر سیدھے لیٹے تھے — ان کی آنکھیں بند تھیں — سینے تک چادر اوڑھے ہوئے تھے — ان کی مسہری کے ساتھ تپائی پر چائے کا وہ کپ رکھا تھا جو رات شکور ان کے لیے لایا تھا —

کپ پلیٹ میں ہی رکھا تھا اور خالی تھا۔ گویا سونے سے پہلے انہوں نے پوری چائے پی لی تھی۔ پھر آخر — اُن کی آنکھ کیوں نہ کھلی تھی —

"شاید ڈیڈی بے ہوش ہیں، ورنہ اس قدر شور سے اُن کی آنکھ ضرور کھلتی" خاور احمد کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

آفتاب تیر کی طرح بستر کی طرف گیا۔ اُس نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر چابیوں کا گچھا نکالا اور پھر یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا:

"آصف — فرحت — ان لوگوں میں سے کسی کو کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانے دینا۔ میں ابا جان کو بُلا کر لا رہا ہوں۔"

اُس کے الفاظ نے آصف اور فرحت کے جسموں میں سردی کی لہر دوڑا دی — کیونکہ ان الفاظ کا مطلب بہت خوفناک تھا۔ انہوں نے گھبرا کر خاور احمد کی طرف بغور دیکھا اور پھر فوراً ہی انہیں یہ بات معلوم ہو گئی کہ آفتاب کا خیال بالکل درست تھا؛ چنانچہ آصف نے بلند آواز میں کہا:

"آپ سب لوگ اپنی جگہ پر موجود رہیں۔ ہلنے جلنے اور کسی چیز کو چھونے کی کوشش نہ کریں — بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ کمرے سے باہر نکل جائیں۔"

"کیا مطلب — ہم ایسا کیوں کریں آخر" خاور احمد نے پوچھا۔

چیخ کر کہا —

"اس لیے کہ خان احمد اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ مر چکے ہیں اور ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ان کی موت کس طرح واقع ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے۔ ان کی موت قدرتی ہو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے خودکشی کی ہو اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ انہیں کسی نے قتل کیا ہو۔"

"کیا..." کمرے میں موجود سب لوگ چلّا اُٹھے۔ ان کے چہروں پر خوف پھیل گیا — رنگ سفید پڑ گئے — چند لمحے مکمل خاموشی کے عالم میں گزر گئے۔ آخر خاور احمد نے کہا:

"یقین نہیں آتا کہ ڈیڈی اس دنیا میں نہیں ہیں — رات تو یہ بالکل ٹھیک تھے — اور یہ آپ نے کیا کہا کہ ہو سکتا ہے، انہوں نے خودکشی کی ہو یا کسی نے انہیں قتل کر دیا ہو — غلط — بالکل غلط — نہ انہوں نے خودکشی کی۔ نہ کسی نے انہیں قتل کیا۔ یہ ضرور قدرتی موت مرے ہیں، کیونکہ ان کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی — یہ تو سب کے لیے فرشتہ تھے فرشتہ۔"

وہ اس کے الفاظ سُن کر حیران رہ گئے۔ اچانک کرسیوں کے ساتھ والی میز پر پڑی ایک چمک دار چیز پر آصف کی نظریں جم کر رہ گئیں — پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں فرحت نے بھی

اس چیز کو دیکھ لیا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔

•

میز پر جو چیز انہیں نظر آئی تھی، وہ وہی سنہری زنجیر تھی، جسے خاور احمد اپنی انگلی پر گھماتے رہنے کا عادی تھا۔

زنجیر

قدموں کی آواز پر ان سب کو اپنا رُخ دروازے کی طرف کرنا پڑا، انہوں نے دیکھا، انسپکٹر کامران مرزا، آفتاب کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ دروازے پر پہنچتے ہی انہوں نے کہا:

"مجھے امید ہے، کسی چیز کو چھیڑا نہیں گیا ہو گا اور ہر چیز ہوں کی توں موجود ہو گی۔"

"جی بالکل — ہر شخص اپنی جگہ پر موجود رہا ہے۔" آصف بولا —

"میں سب سے پہلے اپنے دوست کا معائنہ کروں گا۔" یہ کہہ کر انسپکٹر کامران مرزا آگے بڑھے۔ انہوں نے پہلے تو خاور احمد کی نبض دیکھی، پھر جسم اور دل کا مقام ٹٹول کر دیکھا۔ جسم بالکل اکڑ چکا تھا —

"یہ مر چکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں — اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کی موت کس طرح واقع ہوئی ہے — یہ ڈاکٹر ہی بتا سکتے ہیں

خدا کرے یہ اپنی قدرتی موت مرے ہوں۔ اسی طرح ہم سب کے سب الجھن سے بچ جائیں گے۔"

"الجھن — کیسی الجھن —" وکیل نے کہا۔

"دیکھیے نا —" انسپکٹر کامران مرزا نے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔

"آفتاب — دیکھو کون ہے۔ اگر یہ محلے کے آدمی ہوں تو انھیں یہیں لے آنا۔"

"جی بہت بہتر" آفتاب نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا صدر دروازے کی طرف چلا گیا — جلد ہی اس کی واپسی ہوئی۔ انھوں نے دیکھا کہ اس کے پیچھے محلے کے آدمی تھے۔ ان میں ڈاکٹر صاحب سب سے آگے تھے، وہ سیدھے اندر آئے اور لاش پر جھک گئے — انھوں نے اس کا پوری طرح معائنہ کیا اور پھر حیران ہوئی آواز میں بولے۔

"ان کی موت زہر سے ہوئی ہے — بالکل صحیح بات پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بتائے گی۔" وہ سیدھے ہوتے ہوئے بولے۔

"آپ کے خیال میں ان کی موت کب واقع ہوئی۔" انسپکٹر کامران مرزا نے پوچھا۔

"رات دس بجے سے لے کر بارہ بجے تک — کسی وقت ہوئی ہے —"

"لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔" آصف حیران ہو کر بولا۔

"کیا کس طرح ہو سکتا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے فوراً کہا۔

"یہ کہ انھیں کسی نے زہر دیا ہو، رات کو آخری بار شکور بابا ان کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ یہ چائے کا کپ مرحوم خان احمد کے لیے لے گئے تھے — ہم نے انکل خان احمد کے دروازہ بند کرنے کی آواز خود سنی تھی۔ گویا دروازہ بند کر کے انھوں نے چائے پی، اور سونے کے لیے لیٹ گئے — آپ چائے کا کپ دیکھ رہے ہیں — وہ بالکل خالی ہے — آخر وہ کیسا زہر تھا — کہ خان احمد کے پورا کپ ختم کرنے کے بعد ہی اس نے اثر شروع کیا — اور پھر اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ انھیں زہر شکور بابا نے دیا ہے — کیا شکور بابا اتنے ہی سیدھے ہیں کہ خود ہی کپ میں زہر ڈال کر دے دیں اور یہ خیال بھی کر لیں کہ انھیں قاتل نہیں سمجھا جائے گا — اسی لیے میں کہتا ہوں کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔" آصف جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

"ہم اس کا جائزہ بعد میں لیں گے کہ کیا کس طرح ہو سکتا ہے — پہلے تو لاش کے سلسلے میں کارروائی مکمل کی جائے گی۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"ہوں، یہ بھی ٹھیک ہے — لیکن اس سے پہلے آپ کرسیوں کے پاس رکھی میز پر پڑی چیز کی طرف ضرور توجہ فرمائیں — میرے خیال

ہیں۔ یہ کچھ کم اہم نہیں۔" آصف نے کہا۔

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی سب کے سب میز کی طرف لپک گئے اور پھر خاور احمد کے منہ سے بے ساختہ انداز میں نکلا۔

"ارے — یہ یہاں کیسے آگئی؟"

میز پر پڑی زنجیر پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا — اس کے جسم میں تھرتھری دوڑتی انہوں نے صاف محسوس کی —

"تو کیا یہ آپ کی ہے!" — انسپکٹر کامران مرزا نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"ج — جی ہاں۔" خاور احمد ہکلایا۔

"خیر — آپ سب لوگ باہر تشریف لے جائیں — سب معاملات بعد میں دیکھے جائیں گے اور ہاں — حویلی سے باہر جانے کی آپ میں سے کوئی بھی کوشش نہیں کرے گا — دروازے پر یوں بھی پولیس موجود ہے — وہ کسی کو باہر نہیں جانے دے گی — جب تک کارروائی مکمل نہیں ہو جاتی — آپ سب یہیں رہنے پر مجبور ہیں۔ کارروائی کے بعد بھی میری اجازت لے کر جانا ہوگا۔"

الفاظ سن کر ان سب کے منہ بن گئے؛ تاہم ان میں سے کوئی بولا کچھ نہیں۔ خاموشی سے باہر نکل گئے — انسپکٹر کامران مرزا ان کے قریب کھسک آئے اور بولے؛

"جتنی دیر میں کارروائی مکمل ہو، تم مجھے رات کے حالات اور واقعات تفصیل سے سُنا دو۔"

"جی بہتر — میں بیان کرتا ہوں۔" آصف بولا۔

"ٹھیک ہے — اگر آصف درمیان میں کوئی خاص بات بتانا بھول جائے تو تم دونوں اسے ٹوکنے کی کوشش کرنا۔"

"بہت اچھا، ہم ایسا ضرور کریں گے۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

"تم بلاوجہ ہی خوش ہو رہے ہو، انشاء اللہ ایسا موقع نہیں آئے گا۔" آصف جل بھن کر بولا۔

"خیر خیر — دیکھا جائے گا۔"

"بس وقت ضائع کرو۔" انسپکٹر کامران مرزا نے اکتا کر کہا اور آصف نے انہیں ہر بات تفصیل سے سنا دی — کہ کس طرح انہوں نے دو گھنٹے خاور احمد کے ساتھ گزارے، پھر وکیل صاحب آئے، انہوں نے وصیت سنائی اور خان احمد کے دستخط کرائے، انہوں نے بھی بطور گواہ دستخط کیے — وصیت کے الفاظ بھی اس نے دہرا دیے — پھر ان تینوں غنڈہ نما آدمیوں کی آمد اور خان احمد سے ملاقات کے بارے میں بتایا — خان احمد نے ان کے بارے میں کیا بتایا اور آفتاب نے ان تینوں کو کیا باتیں کرتے سُنا، یہ بھی بتایا — پھر وہ ان کی موجودگی میں خان احمد کے کمرے میں بھی گئے — اس کے بعد انہوں نے ان تینوں کو

کمرے سے نکل کر جاتے دیکھا اور پھر شکور، خان احمد کے
لیے چائے لے کر آیا — وغیرہ وغیرہ — یہ ساری تفصیل سن کر
انسپکٹر کامران مرزا سوچ میں گم ہو گئے۔ آخر انھوں نے سر
اوپر اُٹھایا —

"حالات حد درجے حیرت انگیز اور پُر اسرار ہیں اور ان سب
باتوں سے زیادہ پُر اسرار بات یہ ہے کہ قاتل کے پاس زہر کہاں
سے آیا — شکور کے پاس تو قتل کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں —
اس گھر میں، اگر کسی کے پاس قتل کرنے کی کوئی وجہ ہے تو وہ
ہے خاور احمد یا پھر وہ تینوں ملاقاتی — کیونکہ خاور احمد جائداد
جلدی حاصل کرنے کے لالچ میں ایسا اقدام کر سکتا ہے اور ان
تینوں کا خان احمد سے کیا معاملہ ہے، یہ ابھی ہمیں معلوم نہیں —
بہر حال شاید ان کے پاس بھی کوئی وجہ موجود ہو، ان کے علاوہ
گھر میں رہ گئے وکیل صاحب اور تین ملازم — وکیل صاحب کو
وصیت نامے کی رو سے جائداد میں کچھ نہیں ملے گا، شاید انہیں خان
احمد ہر سال فیس ادا کرتے رہے ہیں۔ تینوں ملازموں کو خان احمد
کی وفات کے بعد دس دس ہزار روپے ملنے ہیں — لیکن یہ بات
عقل سے نہیں اترتی کہ صرف دس ہزار روپے کے لیے اور وہ بھی
جلدی حاصل کرنے کے لیے ان میں سے کسی ایک نے انہیں زہر
دے دیا ہو — دوسرے یہ کہ زہر انھوں نے کیسے حاصل کیا ہو

گا — لہٰذا اس کا امکان بہت ہی کم نظر آتا ہے — چنانچہ ثابت
ہوا کہ یا تو وہ تینوں خفیہ یا ان میں سے کوئی ایک خفیہ قاتل
ہے اور یا پھر خاور احمد — جیسا کہ تمہارے تاثرات سے صاف ظاہر
ہے کہ اسے اپنے باپ سے ذرا سی بھی محبت نہیں تھی اور وہ یہ
چاہتا تھا کہ خان احمد مسجد کے لیے جائداد میں سے کوئی پیسہ نہ دیں،
لیکن انھوں نے اس کی بات نہیں مانی — جس کا اس نے برا
مانا — ہو سکتا ہے رات میں کسی وقت اسے بہت زیادہ غصہ آ گیا
ہو اور وہ خان احمد کے دروازے پر پہنچ گیا ہو — دستک دے
کر اس نے انہیں جگایا ہو اور — لیکن نہیں — خیال تو یہ ہے کہ
زہر انھوں نے چائے کے ذریعے پیا ہے — تب پھر وہ باورچی خانے
کے آس پاس کہیں چھپ گیا ہوگا اور جونہی شکور نے خان احمد کے
لیے چائے کا کپ تیار کیا، اس نے نظر بچا کر زہر کپ میں
ڈال دیا — وہ کوئی تیز زہر تھا — جس نے فوراً ہی خان احمد کو
ختم کر دیا، بس انہیں مہلت دی تو صرف اتنی کہ وہ چائے کا
کپ ختم کر سکے — اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خاور احمد کے
پاس زہر کہاں سے آیا — تو یہ ہم معلوم کرنے کی کوشش کریں
گے —"

ان کی بحث جاری رہی، یہاں تک کہ کام مکمل کر لیا گیا اور
لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ساتھ لے گیا — انسپکٹر کامران مرزا

نے انہیں ہدایت کی تھی کہ جلد از جلد پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور چائے کے کپ کی رپورٹ انہیں ارسال کی جائے ــــ خاور احمد کی زنجیر انہوں نے اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔

"آؤ ــ اب ان لوگوں سے دو دو باتیں ہو جائیں۔"

یہ کہہ کر وہ خاور احمد کے کمرے کی طرف مڑ گئے ــ اس وقت تک ان کے خیال میں خاور احمد ہی قاتل تھا۔ حالات اور واقعات اسی کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور وہ ایک آرام کرسی میں دھنسا ہوا تھا۔ آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ان کے قدموں کی آواز سن کر ایک دم سیدھا ہو گیا اور پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

"آئیے جناب آئیے۔"

"شکریہ۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے اور چاروں اس کے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"کیا خان احمد کو آپ نے زہر دیا ہے؟" انسپکٹر کامران مرزا نے پہلا سوال کیا۔

"جی نہیں ــ مجھے یہ گھناؤنا جرم کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی ــ ڈیڈی اپنی وصیت لکھ چکے تھے اور اس کی رو سے مجھے چوتھائی دولت اور ساری جائداد مجھے ہی ملتی۔ پھر بھلا میں ان کی زندگی ختم کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کرتا۔"

"لیکن ان کی زندگی میں آپ اس دولت اور جائداد کے مالک نہیں بن سکتے تھے ــ ہو سکتا ہے آپ نے فوراً ہی مالک بن جانا چاہا ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ ڈیڈی نے مجھے کبھی کسی چیز کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا ــ روپے پیسے اور دنیا کی ہر چیز بے حساب مجھے دی جاتی رہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر ہم اس زنجیر کو کس خانے میں فٹ کریں گے جو کمرۂ واردات سے ملی ہے ــ زنجیر آپ کی ہے ــ"

"لیکن اصل بات یہ نہیں ہے کہ زہر چائے میں ملا کر دیا گیا ہے ــ اس صورت میں بھلا زنجیر کے کمرے میں ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے ــ صاف ظاہر ہے۔ میں رات کو رخصت ہوتے وقت اپنی زنجیر اندر ہی بھول گیا ہوں گا۔" خاور احمد نے جھلاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"زہر اگر چائے میں دیا گیا ہے۔ تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ چائے میں زہر کس وقت ملایا گیا، یہ ابھی کسی کو معلوم نہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ زہر عین اس وقت ملایا گیا ہو، جب شکور نے چائے کا کپ لے جا کر اندر رکھ دیا ہو۔" وہ بولے۔

"لیکن ابا جان! یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ شکور جس وقت چائے لے کر گیا۔ اس وقت کمرے میں انکل خان احمد کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا ــ اس بات کے تو چشم دید گواہ ہم بھی ہیں۔" آصف

نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن دروازہ بند کیے جانے کی آواز سن کر [آپ] تو اپنے کمرے میں چلے آئے تھے۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ اس وقت خاور احمد نے دروازے پر دستک دی ہو اور ایک ب[ار] پھر خان احمد نے ان کے لیے دروازہ کھول دیا ہو۔۔۔ یہ کسی بہا[نے سے] اندر گئے ہوں اور ان کی نظر بچا کر زہر۔۔۔ زہر۔۔۔"

ان کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔۔۔ ان کی نظریں اس الماری میں جم کر رہ گئی تھیں جو ان کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھ[ی] اور اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔

○

آفتاب، آصف اور فرحت نے انہیں حیران ہو کر دیکھا، خاور اح[مد] کے چہرے پر بھی حیرت اور گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔۔۔ ان کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے انہوں نے بھی الماری کی طر[ف] دیکھا، لیکن انہیں کوئی خاص چیز نظر نہ آئی۔۔۔ یہ دواؤں کی الما[ری] تھی۔۔۔ اور دواؤں کی الماری تو تقریباً ہر گھر میں ہی ہوتی ہے۔ ابھی وہ حیران ہو کر فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ انسپکٹر کامران مر[زا] تیزی سے اٹھے اور الماری کے قریب چلے گئے۔۔۔ اب تو ان سے

[رہا نہ] گیا۔۔۔ اٹھے اور ان کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ انہوں نے دیکھا [د]واؤں کی شیشیوں اور بوتلوں کی قطار میں ایک شیشی رکھی تھی۔ شیشی پر [سرخ] روشنائی سے موٹے لفظوں میں زہر لکھا ہوا تھا، لفظ انگریزی میں تھا اور اس کے اوپر کھوپڑی اور بازوؤں کی ہڈیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔۔۔ جو خطرے کا نشان ہے۔ شیشی کے اندر انہیں سفید رنگ [کا] سفوف بھی نظر آیا۔۔۔ ان کے سانس تیز تیز چلنے لگے۔۔۔ شیشی کو ہاتھ لگائے بغیر انسپکٹر کامران مرزا خاور احمد کی طرف مڑے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آپ کے کمرے میں، دواؤں کی یہ الماری دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ لیکن اس سے زیادہ خوشی زہر کی یہ شیشی دیکھ کر ہوئی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر خوشی اس بات پر ہوئی کہ آپ ایسی الماری کو تالا نہیں لگاتے جس میں زہر کی شیشی تک موجود ہے۔"

"آپ۔۔۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" خاور احمد جھلایا۔

"میں کیا کہوں گا، زہر کی یہ شیشی کہے گی۔۔۔ آصف ——— [ت]ب انسپکٹر شاہد کو فون کرو۔۔۔ اس سے کہو، فوراً یہاں چلا آئے [تا]کہ اس شیشی پر سے انگلیوں کے نشانات لیے جا سکیں۔"

"جی کیا مطلب!" خاور احمد نے بوکھلا کر کہا۔

"آپ کس بات کا مطلب پوچھنا چاہتے ہیں؟" انسپکٹر کامران مرزا نے برا سا منہ بنایا۔

"آپ — کیا آپ یہ خیال کر رہے ہیں کہ ڈیڈی کو زہر میں نے
دیا ہے" اس نے گھبرا کر کہا۔

"ان حالات میں اور خیال کیا بھی کیا جا سکتا ہے — کیا آپ یہ
سمجھتے ہیں کہ آپ کے کمرے کی اس الماری میں زہر کا کیا
کام ہے؟"

"ہاں، ضرور بتا سکتا ہوں — میں کبوتر پالنے کا بہت شوقین
ہوں — چھت پر آپ سینکڑوں کبوتر دیکھ سکتے ہیں — چند ماہ پہلے
ان میں ایک عجیب بیماری پھیل گئی تھی — میں نے کبوتروں کے
ایک ماہر سے مشورہ کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ کبوتروں کے پنجروں
میں جراثیم پیدا ہو گئے ہیں۔ جب تک وہ جراثیم نہیں مریں گے
اس وقت تک کبوتر مرتے رہیں گے۔ پھر اس نے مجھے یہ زہر
لکھ کر دیا اور ہدایت کی، اس کی ذرا سی مقدار پانی میں حل
کر کے، اس پانی کو پنجروں کے فرش اور دیواروں پر چھڑکا جائے
میں نے یہی کیا اور کبوتر تندرست ہونے لگے —" اس نے بتایا۔

"لیکن کیمسٹ نے آپ کو زہر کس طرح دے دیا — اس طرح
کسی کو زہر دینا غیر قانونی ہے"

"کبوتروں کے ماہر نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر کو فون کیا تھا۔
پھر میں اس کے پاس گیا تھا اور اس نے اپنے پیڈ پر زہر کا نام
لکھ کر دیا تھا۔"

"کیمسٹ نے زہر دیتے وقت آپ سے یہ بھی کہا ہوگا کہ زہر کو
احتیاط سے استعمال کیا جائے اور تالا لگا کر رکھا جائے، کیونکہ
یہ انسانی زندگی کے لیے بھی بہت خطرناک ہے۔"

"جی — جی ہاں: اس نے یہ الفاظ کہے تھے" خاور احمد ہکلایا۔

"اور اس کے باوجود آپ نے الماری کو کھلا چھوڑا ہوا ہے" انسپکٹر
عمران مرزا نے اسے گھورا۔

"جی — وہ — میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ گھر
میں کوئی بچہ تو ہے ہی نہیں اور اس واقعے کے بارے میں تو میں
نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا"

"لیکن ہم یہ کیوں نہ سوچیں گے کہ آپ نے خود ہی اپنے ڈیڈی
کی چائے میں یہ زہر ملایا اور الماری کو آپ پہلے ہی کھلا چھوڑتے
رہے ہوں تاکہ آپ کے علاوہ دوسروں پر بھی شک کیا جائے"

"نہیں نہیں — ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ مجھے زبردستی قاتل
بنانے کی کوشش نہ کریں" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"بے فکر رہیں۔ میں زبردستی کسی کو بھی قاتل نہیں بناتا —
آپ کے خلاف جب تک پورا ثبوت نہیں مل جائے گا، اس وقت
تک آپ کو گرفتار نہیں کیا جائے گا — اس وقت تک آپ کے
خلاف دو ثبوت مل چکے ہیں۔ پہلا ثبوت تو یہ زہر کی شیشی —
جو آپ ہی خرید کر لائے تھے — کیا خبر قتل کا منصوبہ پہلے سے

آپ کے ذہن میں موجود ہو اور آپ کبوتروں کی بیماری کا بہانہ کر کے
کبوتروں کے ماہر کے پاس گئے ہوں — تاکہ زہر پہلے
سے ہی حاصل کر لیا جائے۔ دوسرا ثبوت آپ کی سنہری زنجیر
جو خاور احمد کے کمرے کی میز سے ملی ہے — اب اگر اس شیشی
پر سے کسی اور کی انگلیوں کے نشانات نہ ملے تو پھر آپ کے
علاوہ بھلا کون قاتل ہو سکتا ہے — کیونکہ چائے میں شامل کرنے
کے لیے زہر کل رات یا اس سے ایک آدھ دن پہلے لیا گیا ہو
گا — اس صورت میں جس نے بھی زہر نکالا، اس کی انگلیوں کے
نشانات شیشی پر موجود ملیں گے" انسپکٹر کامران مرزا کہتے چلے جا
رہے تھے کہ خاور احمد نے ان کی بات کاٹ دی۔

"زنجیر کے بارے میں، میں کہہ چکا ہوں کہ میں رخصت ہوتے
وقت کمرے میں بھول آیا ہوں گا۔ یہ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں
زنجیر عام طور پر ادھر ادھر بھول ہی جاتا ہوں۔ خود آپ کے
بچے بھی اس بات کے گواہ ہیں۔ ان سے پوچھیے کل رات جب
میں ان کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا تو کیا اٹھتے وقت میں
نے زنجیر وہیں نہیں گرا دی تھی اور اس کے بغیر ہی نہیں چل کھڑا
ہوا تھا — پوچھیے ان سے" اس نے پُرزور لہجے میں کہا۔

"ہوں — ایسا تو خیر واقعی ہوا تھا —" فرحت نے کچھ سوچتے
ہوئے کہا، "لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر

...راق ہو تاکہ ایسے موقع پر ہماری گواہی دلوا سکیں۔
...ن ندا — آپ لوگوں کے پاس تو ہر بات کا گھڑا گھڑایا
...ب موجود ہے — اب میں کیا کروں؟"
...بھی فرصت میں کسی وکیل کا بندوبست کر لیں، لیکن وہ وکیل
...ی نہیں ہو سکتے — کیونکہ اس وقت وہ بھی اس کیس کی
...تفتیش میں شامل ہیں۔"
"دیکھیے — میری بات سنیے — آپ تینوں ملاقاتیوں کو کیوں
بھول رہے ہیں — جو رات ڈیڈی سے ملنے آئے تھے۔ ہم نہیں
جانتے کہ وہ کیوں آئے تھے، کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟"
خاور احمد نے کہا۔

"ہم تو کسی کو بھی نہیں بھول رہے، انہیں بھی پوری طرح
گرفتار کیا جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں — ایک ایک شخص سے پوچھ
گچھ کی جائے گی — وہ تینوں بھی جب تک اصل بات نہیں بتا
دیں گے، انہیں بھی جانے نہیں دیا جائے گا — اور اب ہم انہی
کی طرف جا رہے ہیں — بس ذرا یہ شیشی"

اسی وقت کریم نے آ کر بتایا کہ سب انسپکٹر شاہد آ گئے ہیں۔

"انہیں یہیں لے آئیے۔"

جلد ہی شاہد اندر داخل ہوا اور اس نے آتے ہی کہا۔

"خان احمد مرحوم کو زہر سے ہی ہلاک کیا گیا ہے۔ زہر اسی

چائے میں ملایا گیا تھا جو انھوں نے سوتے وقت پی۔ ڈاکٹر کے بیان کے مطابق یہ ایک ایسا زہر ہے کہ ایک آدھ منٹ کے بعد اثر شروع کرتا ہے اور آدمی اچانک اپنا دم گھٹتا محسوس کرتا ہے — اس کے حلق سے آواز تک نہیں نکلتی — نہ وہ تڑپ سکتا ہے — بس دیکھتے ہی دیکھتے دوسری دنیا کی طرف چلا جاتا ہے —"

"چلو! اب ایک کام اور۔ اس شیشی کو اپنے قبضے میں لے لو۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس پر کس کس کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے شاہد سے کہا۔

"جی بہت بہتر۔"

"اس کے ساتھ ہی گھر میں موجود تمام لوگوں کی انگلیوں کے نشانات بھی لے جاؤ اور مجھے بذریعہ فون اطلاع دو کہ شیشی پر کس کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔"

"بہت بہتر جناب —" یہ کہہ کر شاہد آشا اور الماری کی طرف چلا گیا — اس نے جیب سے رومال نکالا اور شیشی کو اس رومال میں لے لیا — اس کے بعد اُس نے اجازت لی اور رخصت ہو گیا۔

"اور اب ہم ان تینوں سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے چلتے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا اُٹھتے ہوئے بولے۔

"انکل! اس موقع پر مجھے ایک خاص بات یاد آئی ہے، اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں۔"

"اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ خاور احمد صاحب کے سامنے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے تو ضرور بتا دو۔" وہ بولے۔

"میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ بات بتائی بھی ان کے سامنے چاہیے —"

"تب تو اور بھی اچھی بات ہے — جلدی بتاؤ۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"بات دراصل یہ ہے انکل کہ —"

"خدا کے لیے اب بس تم کر کے بعد اٹک نہ جانا — جس طرح آفتاب اٹکا کرتا ہے۔"

"نہیں آپ فکر نہ کریں، آفتاب میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔" فرحت نے فوراً کہا۔

"وہ تو صاف ظاہر ہے، میں لڑکا ہوں اور تم لڑکی۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"جتنی ذرا سی تو ہو — یہ کہنا کیا چاہتی ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے منہ بنایا۔

"بات یہ ہے انکل — کہ خاور احمد صاحب نے بتایا ہے کہ یہ زبیر خان احمد صاحب کے کمرے میں مشغول گئے ہوں گے — حالانکہ

"یہ بات بالکل غلط ہے۔ کیونکہ جب یہ ہمارے ساتھ ان کے کمرے
سے باہر نکلے تھے تو زنجیر ان کے ہاتھ میں تھی اور یہ برابر اسے
اپنی انگلی پر گھما رہے تھے۔"
"اوہ!" انسپکٹر کامران مرزا کے منہ سے نکلا اور پھر ان کی نظریں
خاور احمد پر جم گئیں۔

راز کی فروخت

کمرے میں یک دم موت کی خاموشی طاری ہو گئی۔ انسپکٹر
کامران مرزا کی آنکھیں خاور احمد پر جم گئیں۔ اس کا رنگ سفید
پڑ گیا۔ پھر آصف کی آواز کمرے میں گونجی۔
"ہاں، فرحت نے بالکل ٹھیک کہا۔ مجھے بھی یاد آگیا ہے،
زنجیر اس وقت ان کے ہاتھ میں تھی اور یہ اسے اپنی انگلی میں
گھما رہے تھے۔"
"میں بھی اس بات کا پوری طرح گواہ ہوں۔ زنجیر کو انگلی
پر گھماتے ہوئے نعمان احمد کے کمرے سے نکلنا مجھے اچھی طرح
یاد آگیا ہے۔" آفتاب بولا۔
"اب آپ کیا کہتے ہیں؟"
"میں۔ میں کیا کہوں۔ شاید میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے
یہ کہنے کی بھلا کیا ضرورت تھی کہ میں زنجیر کمرے میں بھول گیا
ہوں گا۔ مجھے تو سچ بات کہنی چاہیے تھی اور سچ بات یہ

ہے کہ صبح شور شرابا سن کر میں ڈیڈی کے کمرے کے دروازے
پر پہنچا اور پھر دروازہ ٹوٹنے پر جب میں دوسروں کے ساتھ
اندر داخل ہوا تو میری نظر سب سے پہلے میز پر پڑی زنجیر
پر گئی — میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ زنجیر یہاں کس
طرح پہنچ گئی۔ رات تو یہ میرے ہاتھ میں تھی — سوتے وقت
میں نے اسے اپنے سرہانے رکھ دیا تھا — میں نے چاہا، آگے
بڑھ کر اسے اٹھا لوں اور جیب میں ڈال لوں — لیکن آپ
کے تینوں بچوں کی تیز نظروں نے مجھے سہما دیا اور میں اپنی جگہ
سے ہل نہ سکا — تو جناب — بات دراصل یہ ہے کہ زنجیر
میرے کمرے سے کسی نے اٹھا کر ڈیڈی کے کمرے میں رکھی
ہے اور یہ کام صرف اور صرف قاتل کا ہی ہو سکتا ہے۔
قاتل چاہتا ہے، پولیس اس کی بجائے مجھے پکڑ لے — یہاں
تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"لیکن قاتل کو یہ موقع کس طرح مل سکتا تھا کہ وہ آپ کے
کمرے میں داخل ہوتا زنجیر اٹھاتا اور پھر مقتول کے کمرے میں
رکھتا۔" آفتاب نے اعتراض کیا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ اس نے یہ موقع کس طرح حاصل
کیا — مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ اس نے کسی نہ کسی طرح
زنجیر میرے کمرے سے اٹھائی اور ڈیڈی کے کمرے میں رکھ دی۔

ہاں اس وقت شاید بتا سکوں، جب مجھے قاتل کا نام معلوم
ہو جائے۔"

"لیکن آپ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ آپ کے کمرے میں کل رات
سے لے کر صبح تک کون کون داخل ہوا؟"

"میں آپ کے بچوں کو رحیم کے حوالے کر کے اپنے کمرے میں
داخل ہوا۔ پھر میں نے کریم کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی، کیونکہ
میں بھلا سوتے وقت چائے پینے کا عادی ہوں — کریم اندر آیا
تو میں اونگھنے لگا تھا۔ اس کی آواز سن کر میں چونکا اور میں
نے اسے چائے لانے کے لیے کہا — جب وہ چائے لایا تو میں
اس وقت بھی اونگھ رہا تھا — تاہم اس کے جانے کے بعد
میں نے چائے پی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور سو گیا۔
صبح کریم نے جگایا — میں کمرے سے نکل گیا — صبح کے وقت
میں ہوا خوری کا عادی ہوں — اس دوران کمرے کا دروازہ
کھلا رہتا ہے، تاکہ کریم کمرے کی صفائی کر دے اور چیزیں ترتیب
سے رکھ دے — ہو سکتا ہے، اس وقت قاتل نے زنجیر اڑا لی
ہو —" وہ جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

"خیر — ہم دیکھیں گے کہ آپ کا بیان کہاں تک درست
ہے — اب ہم چلیں گے۔"

وہ اس کے کمرے سے نکل آئے۔ چاروں گہری سوچ میں

گم تھے — برآمدے میں قدم اٹھاتے ہوئے انسپکٹر کامران مرزا بولے

"خالد احمد کے بیان کی روشنی میں پہلے ہمیں کریم سے مل لینا چاہیے — اس کے بعد ہم ان تینوں سے ملیں گے۔"

"یہی مناسب ہے۔" فرحت بولی۔

"ویسے فرحت — تم نے خوب موقع پر یہ بات ظاہر کی۔" انسپکٹر کامران مرزا نے اس کی تعریف کی۔

"حالانکہ انکل — یہ بات مجھے شروع سے یاد تھی۔" فرحت مسکرائی —

"توبہ! اپنے منہ میاں مٹھو تو نہ بنو۔" آفتاب نے جل کر کہا۔

"اچھا — اب نہیں بنوں گی۔" فرحت مسکرا کر بولی۔

اسی وقت دوسری طرف سے کریم آتا نظر آیا، شاید وہ خالد احمد کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

"ہیلو کریم بابا — ہم تو آپ کی ہی تلاش میں تھے — ہمیں آپ سے کچھ سوالات کرنا ہیں۔"

"لیکن جناب — مجھے چھوٹے صاحب نے بلایا ہے۔"

"تم ان کے پاس چند منٹ ٹھہر کر چلے جانا —" انسپکٹر کامران مرزا بولے —

"اس طرح تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔"

"کوئی پرواہ نہیں، اگر انہوں نے تمہیں ملازمت سے نکال دیا تو سے زیادہ تنخواہ پر تمہیں ملازم کرا دوں گا — آؤ میرے ساتھ۔"

کریم کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار نمودار ہوئے — آخر وہ ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لے آئے۔

"بات جب تمہیں تمہارے چھوٹے صاحب نے بلایا تو وہ کیا کر رہے تھے؟" انہوں نے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

"کیا کر رہے تھے —" کریم نے سوچنے کے انداز میں کہا۔

"ہاں — کیا وہ کچھ کام کرنے میں مصروف تھے؟"

"جی نہیں — وہ آرام کرسی میں بیٹھے ہوئے تھے۔"

"انہوں نے تمہیں اندر داخل ہوتے ہوئے تو نہیں دیکھا ہوگا۔"

"کیوں نہیں دیکھا ہوگا جناب — انہوں نے مجھے دیکھا تھا اور دیکھتے کہا تھا — چائے لے آؤ — میں تو پوری طرح کمرے میں داخل بھی نہیں ہوا تھا۔"

"اوہ! جب تم چائے لے کر گئے تو وہ کیا کر رہے تھے؟"

"اسی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہاں کسی گہری سوچ میں ضرور غرق تھے۔" اس نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے، وہ پوری طرح ہوش میں تھے، سو نہیں رہے تھے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے سوچ کر سوال کیا۔

"جی نہیں — وہ سو نہیں رہے تھے۔"

"اور نہ وہ اونگھ رہے تھے؟"

"جی نہیں — وہ اونگھ بھی نہیں رہے تھے" کریم بولا — اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہونے لگے تھے — شاید وہ ان سوالات پر حیران تھا جو اس سے کیے جا رہے تھے۔

"اور جس وقت انھوں نے تمہیں گھنٹی بجا کر بلایا تھا، کیا اس وقت بھی وہ اونگھ نہیں رہے تھے؟"

"جی نہیں تو — بالکل نہیں" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"اب ایک بات اچھی طرح سوچ کر بتاؤ — جب تم چائے کا کپ لے کر اندر گئے — یا جب اس سے پہلے کمرے میں داخل ہوئے تھے، تو کیا ان کی زنجیر ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے گھما رہے تھے یا وہ میز پر رکھی تھی؟"

"جی نہیں — وہ اسے گھما رہے تھے — بہت تیزی سے گھما رہے تھے — جب وہ کسی سوچ میں ہوتے ہیں تو زنجیر کو بہت تیزی سے گھماتے ہیں، یہ ان کی بہت پرانی عادت ہے۔"

"بہت بہت شکریہ، تم اس گھر میں کب سے ملازم ہو؟"

"دس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔"

"تم نے چھوٹے صاحب یعنی خاور احمد کو کیسا پایا؟"

"آدمی سخت مزاج ہیں جناب — لیکن کیا کیا جائے، پیٹ پالنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑتا ہے۔"

"تم رہتے کہاں ہو — اور کیا تمھارے بیوی بچے ہیں؟"

"میں یہیں سوتا ہوں۔ ہفتے میں ایک دن کی چھٹی ملتی ہے — اس دن میں اپنے گھر چلا جاتا ہوں — میرے بیوی بچے بھی ہیں" کریم نے بتایا۔

"اپنا پتا لکھوا دو۔"

اس کا پتا لکھنے کے بعد انھوں نے اسے رخصت کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ذہن الجھتے جا رہے تھے، کیونکہ خاور احمد کا ہر بیان غلط ثابت ہو رہا تھا۔ اب ان کا رخ ان تینوں ملاقاتیوں کے کمروں کی طرف تھا — جو رات کے وقت خان احمد سے ملنے آئے تھے۔ انھوں نے پہلے کمرے کے دروازے پر دستک دی، لیکن اس کی بجائے ساتھ والا دروازہ کھلا اور ان میں سے ایک کا سر باہر نکلا۔ ان پر نظر پڑتے ہی وہ چونکا اور پھر بولا۔

"آئیے جناب — ہم اس کمرے میں ہیں۔"

وہ اس کمرے میں داخل ہوئے تو انھوں نے دیکھا، تینوں ناشتا کرنے میں مصروف تھے۔ اس وقت انھیں یاد آیا کہ انھوں نے بھی اب تک ناشتا نہیں کیا — حالات ہی ایسے پیش آئے تھے کہ ناشتے کا کسی کو بھی ہوش نہیں رہا تھا — انسپکٹر کامران مرزا دروازے میں ہی رک گئے — انھوں نے جیب سے قلم اور کاغذ نکالا اور اس پر کچھ لکھ کر آفتاب کو دیتے ہوئے بولے۔

"یہ سوال تینوں ملازموں سے کرنا ہے — اور خود ان کے بارے

میں بھی کرتا ہے — جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کرتا۔"

"جی بہتر۔" آفتاب نے کاغذ لیا اور کمرے سے نکل گیا۔ آصف اور فرحت حیران تھے کہ انھوں نے کیا کچھ کر دیا ہے۔

"میں آپ سے آپ کے بارے میں پوچھنے کے لیے آیا ہوں — آپ ناشتے سے فارغ ہو کر سوالات کے جوابات دینا پسند کریں گے یا میں ابھی شروع کر دوں — جب آپ مناسب سمجھیں۔"

"بس ہم فارغ ہونے ہی والے ہیں۔" اُن میں سے ایک نے کہا۔ وہ انتظار کرنے لگے۔ آخر چند منٹ بعد وہ ناشتے کی میز سے ہٹ کر اُن کے قریب آ بیٹھے۔

"جی! اب پوچھیے — کیا پوچھنا ہے۔"

"آپ تینوں کے نام کیا ہیں؟" انسپکٹر کامران مرزا نے پہلا سوال کیا۔

"میں الطاف خان ہوں۔ یہ سردار خان اور یہ نوروز خان۔" ایک نے تعارف کرایا۔

"آپ تینوں کا خان احمد سے کیا تعلق تھا؟"

"پرانے ملنے والے ہیں۔"

"کل آپ تینوں اُن سے کیوں ملنے آئے تھے؟"

"جی بس یونہی — ملاقات کیے بہت دیر ہو گئی تھی۔"

"تو ملاقات کے لیے آنے کی کوئی اور وجہ نہیں تھی؟" فرحت نے ان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی بالکل نہیں۔"

"لیکن ہم نے آپ کی اور خان احمد صاحب کی گفتگو سنی تھی — دونوں فریقوں کا کسی بات پر جھگڑا ہو رہا تھا — آپ خان احمد صاحب سے جو مطالبہ کر رہے تھے، وہ انھیں منظور نہیں تھا — وہ کچھ کم پر رضامند تھے۔ پھر آپ تینوں کی گفتگو جو آپ لوگوں نے اپنے کمرے میں جا کر کی، ہم میں سے ایک نے سنی تھی — وہاں بھی مطالبے کا ہی ذکر ہو رہا تھا — آخر آپ کو خان احمد سے کیا مطالبہ تھا — اور کیوں؟"

فرحت کے الفاظ نے ان تینوں کو ساکت کر دیا — چند لمحے تک وہ اسے گھورتے رہے، آخر الطاف خان نے کہا:

"ہم سے خان احمد کچھ پرانا سامان خریدنا چاہتے تھے، کچھ عرصہ پہلے بھی ہم یہاں آئے تھے، اس وقت بھی انھوں نے اس سامان کی بات کی تھی — ہم رات بھی اسی سامان کی خرید و فروخت کی بات کر رہے تھے — وہ جو رقم دے رہے تھے، ہمیں منظور نہیں تھی — بس اتنی سی بات ہے۔" الطاف خان نے کہا۔

"وہ سامان کس قسم کا ہے؟" آصف نے پوچھا۔

"کچھ نوادرات ہیں — جو عام لوگوں کے لیے ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتے — مثلاً کچھ بہت پرانے سکے، بہت پرانے ٹکٹ — نقش و نگار والے کچھ برتن وغیرہ —"

"اور یہ سب سامان ہے کہاں !"

"ہمارے گھر میں موجود ہے ۔"

"تو سامان آپ ساتھ نہیں لائے ۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے ۔

"جی نہیں ۔ پچھلی مرتبہ خان احمد اس سامان کو دیکھ چکے ہیں ۔"

"آپ تینوں کام کیا کرتے ہیں ۔ پتا لکھوا دیں ۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے —

"ہم ایک پرائیویٹ فرم کے سیلز مین ہیں ۔ پتا لکھ لیجیے ۔" الطاف خان نے کہا اور پتا لکھوا دیا ۔

"فرم کا پتا بھی لکھوائیے ۔" وہ بولے اور الطاف خان نے فرم کا پتا بھی لکھوا دیا ۔

"فرم کا فون نمبر کیا ہے !" وہ بولے ۔

"فرم بالکل نئی شروع ہوئی ہے — ابھی فون نہیں لگا ۔"

"خیر — گھر کے پتے بھی لکھوائیے ۔"

"ہم تینوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں ۔ لکھ لیجیے ۔" یہ کہہ کر الطاف خان نے گھر کا پتا بھی انہیں نوٹ کروا دیا ۔

"آصف — شاہد کو اسی وقت فون کرو اور اس سے کہو ۔ اس فرم میں جا کر معلومات حاصل کرے — اور یہ بھی کہ یہ تینوں وہاں واقعی ملازم ہیں یا نہیں ۔"

"جی بہت بہتر —" آصف نے کہا اور کاغذ ان کے ہاتھ سے

کر چلا گیا —

اسی وقت آفتاب احمد داخل ہوا ۔ اس کے چہرے پر پرسکون مسکراہٹ رقص کر رہی تھی ۔ "سوائے ملازموں کے اور ہمارے بھی سب ناشتا کر چکے ہیں ۔"

"اوہ !" ان کے منہ سے نکلا ۔ پھر انھوں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا ۔ "تو کیا خاور احمد بھی ناشتا کر چکا ہے !"

"انھوں نے تو سب سے پہلے ناشتا مانگا تھا ۔"

"حیرت ہے — یہاں ایک بجتے بھاگتے ۔ گھر کے مالک کو قتل کر دیا گیا ہے اور گھر کے افراد کو کھانے پینے سے بھی فرصت نہیں یہاں تک کہ ان کا بیٹا بھی ناشتا کر چکا ہے — ایک ہم ہی یا ملازم ہیں جو ابھی تک بھوکے مر رہے ہیں ۔" فرحت نے جل بھن کر کہا —

"فرحت — یہ آصف کدھر گیا !"

"انکل نے اسے بھی ایک کام کے لیے بھیجا ہے ۔"

تھوڑی دیر بعد شاہد کا فون موصول ہوا ۔ اس نے بتایا

"لیجیے جناب — ان تینوں آدمیوں کے بارے میں رپورٹ سنیے ۔ انھوں نے جو پتے بتائے ہیں ۔ وہ بالکل غلط ہیں ۔ نہ اس نام کی کوئی فرم شہر میں موجود ہے ۔"

"ٹھیک ہے تو پھر تم جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کرو ۔" فون سن

تینوں کو اس کے ساتھ بھیج دیا گیا — اب انہوں نے ملازمین سے سوالات کرنے کی ٹھانی — سب سے پہلے وہ شکور سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ جس کپ کے ذریعے خان احمد کی موت واقع ہوئی، وہ اسی کے ذریعے کمرے تک پہنچا تھا — لیکن ابھی وہ اس کمرے سے نکل کر شکور کے کمرے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ کریم نے آکر بتایا:

"آپ کا فون ہے جناب۔"

"اوہ اچھا۔"

چاروں فون کے پاس پہنچے۔ دوسری طرف سے سب انسپکٹر شاہد بات کر رہا تھا، اس کی آواز میں حد درجے گھبراہٹ تھی۔

"جناب مجھے بہت افسوس ہے —"

"ارے بھئی اس میں افسوس کی کیا بات ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرا کر بولے۔ انہوں نے شاہد کو بات بھی مکمل نہ کرنے دی —

"جی کیا مطلب — آپ کو کیا پتا کہ میں کس بات پر افسوس ظاہر کر رہا ہوں۔"

"اس پر کہ وہ تینوں تمہیں غچہ دے کر فرار ہو گئے ہیں۔ کیوں یہی بات ہے نا۔"

"جی — جی ہاں — لیکن آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی —"

کر وہ پھر ان کے کمرے میں آئے۔

"آپ لوگوں نے اپنے پتے غلط کیوں لکھائے، اور فرم کا نام فرضی کیوں لکھوایا؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

"سمجھ میں آئے بھی کیسے، معاملات کو تو آپ لوگ خود بگاڑ رہے ہیں — خیر جیسے آپ کی مرضی —" انسپکٹر کامران مرزا نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"ہم بگاڑ رہے ہیں — کیا مطلب؟" الطاف نے چونک کر کہا۔

"آپ لوگوں نے جو پتے لکھائے غلط ہیں۔ جس فرم کا نام لکھایا وہ بھی غلط ہے۔ اس سے ہم کیا نتیجہ نکالیں۔ یہی نا کہ آپ لوگ معاملات کو الجھا رہے ہیں۔"

"شاید کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے — ورنہ نہ تو یہ پتے غلط ہیں اور نہ فرم کا نام فرضی ہے — بے شک آپ ہمارے ساتھ چل کر تحقیق کر لیں۔"

"ہوں — تو یہ بات ہے — خیر — ابھی سب انسپکٹر شاہد آنے والے ہیں۔ میں آپ تینوں کو ان کے ساتھ بھیج دوں گا، اس طرح آپ کے سچ اور جھوٹ کی تصدیق ہو جائے گی۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" الطاف خان نے فوراً کہا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد سب انسپکٹر شاہد وہاں پہنچ گیا، چنانچہ

"یہ تو ابھی تو دو منٹ پہلے کی بات ہے اور ابھی میں نے کسی اور کو فون بھی نہیں کیا۔"

"جب انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ انہیں کسی کے ساتھ باہر بھیج کر تصدیق کرا لی جائے تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ یہ کسی طرح اس حویلی سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ تاکہ فرار کا موقع ہاتھ آ جائے۔"

"اور آپ نے ان کی خواہش پوری کر دی۔" شاہد کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں! میں نے یہی مناسب خیال کیا تھا۔" انہوں نے کہا پھر فوراً ہی بولے:

"ہاں — میں ان رپورٹوں کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں آخر وہ کب تک ملیں گی۔"

"میں جلد از جلد لے کر آنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟" فرحت کے منہ سے نکلا۔

"صرف اسی طریقے سے یہ بات معلوم ہو سکتی تھی کہ وہ تینوں چاہتے کیا ہیں۔"

"چلو یہ بات اب کس طرح معلوم ہو گی؟"

"بس — تم دیکھتے جاؤ —" انہوں نے کہا اور شکور کی طرف

جانے کے لیے مڑے — عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی — وہ چونک اٹھے — اور پھر کچھ سوچ کر انہوں نے فون اٹھا لیا۔

"ہیلو —" دوسری طرف سے ایک جانی سی آواز میں کہا گیا۔ انسپکٹر کامران مرزا کے کان یہ آواز سن کر کھڑے ہو گئے انہوں نے فوراً ہی حویلی کے ملازم کریم کی آواز منہ سے نکالی۔

"یہ خاور احمد صاحب کی حویلی ہے اور میں ان کا ملازم کریم بول رہا ہوں۔ آپ کو کس سے بات کرنا ہے؟"

"خاور احمد سے — ذرا جلدی سے انہیں بلا دو۔"

"ابھی لیجیے —" یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور میز پر رکھ دیا اور قدموں کی آواز بھی پیدا کی جیسے کوئی اس جگہ سے جا رہا ہو۔ تقریباً ایک منٹ گزرنے کے بعد انہوں نے پھر قدموں کی آواز پیدا کی اور ریسیور اٹھاتے ہوئے بولے:

"ہیلو — میں خاور احمد بول رہا ہوں — آپ کون صاحب ہیں؟"

آفتاب، آصف اور فرحت کے کانوں سے بالکل خاور احمد کی آواز ٹکرائی، لیکن انہیں زیادہ حیرت نہیں ہوئی، کیونکہ اس قسم کے واقع پہلے بھی ان کی زندگی میں آ چکے تھے۔

"میں الطاف خان بول رہا ہوں —" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"الطاف خان — کون الطاف خان — میں سمجھا نہیں۔" وہ بولے۔

"کل رات خان احمد سے ملنے جو تین آدمی آئے تھے، میں

ان میں سے ایک ہوں۔ باقی دو بھی میرے ساتھ ہی کھڑے ہیں۔ ہم تینوں پولیس کی نگرانی سے فرار ہو چکے ہیں اور اب آزاد ہیں۔ ہم آپ کو ایک راز فروخت کرنا چاہتے ہیں۔"

"راز فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ میں سمجھا نہیں۔" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں! ہمارے پاس ایک خوفناک راز ہے۔ ایسا خوفناک کہ اگر ہم اسے اخبار میں شائع کرا دیں تو آپ کہیں کے نہیں رہیں گے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو۔ صاف صاف کہو۔"

"صاف صاف بات یہ ہے کہ آپ خان احمد کے بیٹے نہیں ہیں۔"

قاتل

الطاف خان کے یہ الفاظ کسی دھماکے سے کم نہیں تھے۔ انسپکٹر کامران مرزا کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو اس وقت اپنے بجے پر قابو نہ رکھ سکتا۔ لیکن انہوں نے اپنے حواس بحال رکھے اور کھلائے ہوئے لہجے میں بولے:

"میں سمجھا نہیں۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"میں نے یہ کہا ہے کہ آپ خان احمد کے بیٹے نہیں ہیں۔"

اس مرتبہ الطاف خان نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

"شاید تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ یا پھر تم کوئی پاگل آدمی ہو۔" انہوں نے چیخ کر کہا۔

"سنو چھوٹے صاحب۔ تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپیہ اور ساری جائداد تمہارے ہاتھوں سے ہمارے ایک اشارے سے نکل سکتی ہے۔"

"تو تم نے ہی ڈیڈی کو قتل کیا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کچھ سوچ کر کہا۔

"اپنے ڈیڈی کے قاتل تم خود ہو۔ تم فوراً دولت حاصل
کر لینا چاہتے تھے۔ ہمیں تو خان احمد کو قتل کرنے کی کوئی
ضرورت ہی نہیں تھی — ہم تو ان سے اس راز کا سودا
کرنے گئے تھے — ہم پچاس لاکھ روپے مانگ رہے تھے اور
وہ پچیس لاکھ روپے دینے پر تیار ہو گئے تھے۔ لیکن ہم نے
منظور نہیں کیا تھا اور انہوں نے صبح بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا
لیکن دن نکلا تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے؛ چنانچہ اب
ہم آپ سے بات کر رہے ہیں۔ خان احمد تو اس راز سے
واقف تھے — کہ تم ان کے حقیقی بیٹے نہیں ہو — تمہیں تو
کوئی ان کے دروازے پر ڈال گیا تھا — خان احمد کی بیوی
کے ہاں تو کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے بے شمار
ڈاکٹروں سے اپنی بیوی کا علاج کرایا، لیکن ڈاکٹر بھی کچھ نہ کر
سکے — اور ان کی بیوی اسی غم میں گھل گھل کر مر گئی — پھر
ایک دن کوئی شخص ایک ننھے سے بچے کو ان کی حویلی کے دروازے
پر ڈال گیا — صبح سب سے پہلے ان کی نظر بچے پر پڑی۔ وہ
بچے کو خاموشی سے اپنے کمرے میں لے گئے۔ کمرے کا دروازہ
بند کر کے باہر نکلے اور سب ملازموں کو کئی کئی ماہ کی تنخواہ دے
کر رخصت کر دیا۔ ملازم حیران ہی رہ گئے — کہ یہ کیا ہوا،
انہیں کیوں نکالا گیا — کئی ماہ بعد انہوں نے بالکل نئے ملازم

رکھے اور انہیں یہ بتایا گیا کہ ان کی بیوی یہ چھوٹا سا بچہ چھوڑ
کر مر گئی ہے — اس طرح یہ راز ان کے سینے میں دفن ہو
کر رہ گیا —" یہاں تک کہہ کر الطاف خان خاموش ہو گیا۔
"لیکن تم تینوں کو یہ راز کس طرح معلوم ہو گیا اور تمہارے
پاس ان باتوں کا ثبوت کیا ہے؟"
"جن ملازموں کو پہلے پہل نکالا گیا تھا، ان میں سے تین
بہت ذہین تھے۔ انہوں نے حویلی کے آس پاس رہنا شروع
کر دیا — جب نئے ملازم رکھے گئے تو ان سے پوچھ گچھ کرنے
پر انہیں پتا چلا کہ انہیں یہ بتایا گیا ہے کہ خان احمد صاحب کی
بیوی ایک ننھا سا بچہ چھوڑ کر مر گئی ہے — ان تینوں کو تو اصل
بات معلوم تھی۔ لہٰذا انہوں نے مل کر ایک تجویز سوچی —
تجویز یہ تھی کہ وقت آنے پر خان احمد سے دولت حاصل کی
جائے؛ چنانچہ وہ وقت کا انتظار کرتے رہے — لیکن پھر خان احمد
نے آپ کو ملک سے باہر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج
دیا — تینوں ملازم بہت بوڑھے ہو گئے اور انہوں نے جان
لیا کہ آپ کی واپسی تک وہ شاید ہی زندہ رہ سکیں — وہ
تینوں چاہتے تھے کہ جب آپ واپس آ جائیں اور شہر کے
بے شمار لوگ آپ کے بارے میں جان لیں — آپ سے مل لیں،
اس وقت وار کیا جائے۔ یعنی خان احمد کو بلیک میل کیا جائے —

پھر جب انھوں نے دیکھا کہ وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں تو انھوں نے یہ راز اپنے تینوں بیٹوں کو بتا دیا — اب آپ جان ہی گئے ہوں گے کہ ہم کون ہیں۔"

"تو تم ان تینوں ملازموں کی اولاد ہو۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے —

"ہاں، آپ ٹھیک سمجھے۔"

"اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"پچاس لاکھ روپے — بدلے میں ہم سارے ثبوت آپ کے حوالے کر دیں گے — ورنہ ہوگا یہ کہ یہ خبر اخبار میں شائع ہو جائے گی اور خان احمد کے حقیقی رشتے دار اس دولت اور جائداد کے مالک بن جائیں گے —"

"نہیں نہیں — یہ نہیں ہو سکتا — میں آپ سے مل کر بات کرنا چاہتا ہوں — وہ ثبوت آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں جو آپ لوگوں کے پاس ہے۔"

"تو ٹھیک ہے — ہم آج رات ہی مل لیتے ہیں، بتائیے — کہاں آئیں؟"

"حویلی کے پیچھے درختوں کے درمیان — رات کے ٹھیک بارہ بجے میں موجود ہوں گا —"

"تنہا آئیے گا — اگر آپ نے کسی کو ساتھ لانے کی کوشش

کی تو نتیجہ بہت خوفناک ہو گا۔"

"فکر نہ کرو" وہ بولے —

"بہتر تو یہ ہو گا کہ آپ پچاس لاکھ روپے ساتھ لے کر آئیں۔" الطاف خان نے کہا۔

"سودے کی بات بعد میں ہو گی۔ میں پہلے ثبوت دیکھوں گا —"

"ضرور ضرور — کیوں نہیں۔"

"تو پھر اب رات کو بارہ بجے ملاقات ہو گی۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ انسپکٹر کامران مرزا نے بھی ریسیور رکھ دیا اور ان کی طرف مڑے — اس وقت ان تینوں نے اپنے اپنے کان ریسیور کے قریب کیے رکھے تھے اور انھوں نے بھی ساری گفتگو سن لی تھی —

"کیوں بھئی کیا خیال ہے؟"

"معاملہ تو ہر لمحے الجھتا ہی جا رہا ہے۔" آصف بولا۔

"خیر دیکھا جائے گا — آؤ — اب ذرا شگورہ سے بات چیت ہو جائے — اس کے بعد رحیم سے بھی سوال کریں گے۔"

چاروں مڑے اور پھر ٹھٹک کر رک گئے — ان کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر خان احمد کھڑا انھیں گھور رہا تھا

"ایک بہت خوفناک بات — لیکن قتل کے کیس کی تفتیش ابھی ضروری ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ رات کو بارہ بجے وہ تینوں یہاں آئیں گے۔ اسی وقت آپ کی ان سے ملاقات کرا دی جائے گی — اب آپ آرام کریں"

"آپ مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ معاملہ کیا ہے؟"

"ابھی کچھ بتانا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوگا — رات تک صبر کریں"

یہ کہتے ہوئے وہ اس کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔ شکور اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں چھت پر لگی تھیں۔ شاید بہت گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ ان کے قدموں کی آواز سن کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہم آپ سے کچھ سوال کرنے آئے ہیں"

"میں جانتا ہوں جناب —" اس نے کہا۔ "تشریف رکھیے" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بائیں کان کو زور سے جھاڑا۔ کمرے میں پانچ پرانی وضع کی کرسیاں تھیں۔ اس نے جلدی جلدی ان پر کپڑا مارا اور وہ اُن پر بیٹھ گئے۔

"آپ کو یہاں ملازمت کرتے کتنا عرصہ گزرا؟"

"تقریباً دس سال"

"خان احمد رات کو روزانہ چائے پینے کے عادی تھے —"

کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر بلا کی حیرت بھی طاری تھی۔

○

چند لمحے تک وہ ایک دوسرے کو گھورتے رہے — آخر خاور احمد کے ہونٹ ہلے:

"میں نے آج تک کسی کو کسی دوسرے کی آواز کی اتنی کامیاب نقل اُتارتے نہیں سُنا"

"چلیے آج تو سُن لیا نا — دراصل میں اس کام میں بہت ماہر ہوں" انسپکٹر کامران مرزا مُسکرائے۔

"لیکن آپ کو میرا فون سننے کا کیا حق تھا" خاور احمد نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس گھر میں ایک شخص کو ہلاک کر دیا گیا ہے — قاتل کا پتا لگانا میرا فرض ہے اور اس فرض کی ادائیگی کے سلسلے میں میں کچھ بھی کر سکتا ہوں — ویسے یہ فون اگر آپ سنتے تو شاید آپ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے"

"فون کس کا تھا؟" اس نے لاپروائی سے پوچھا۔

"جو تین مہمان رات خان احمد سے ملنے آئے تھے، اُن کا"

"وہ کیا کہہ رہے تھے؟"

انھوں نے پوچھا

"جی ہاں! ہر روز —"

"اور وہ گھر کے دروازے بھی ہر روز بند کرانے کے عادی تھے —"

"ہاں —" اس نے کہا۔

"لیکن کیوں — کیا انھوں نے کبھی اس کی وجہ بتائی؟" انسپکٹر کامران مرزا نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں نے ان سے بار بار پوچھا — انھوں نے کبھی جواب نہیں دیا — لیکن ایک روز وہ کسی خیال میں گم تھے۔ ایسے میں میں پوچھ بیٹھا کہ آخر آپ دروازے کیوں بند کراتے ہیں اور وہ بھی اپنی نگرانی میں — تو بے خیالی میں ان کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ میں کسی سے خوف زدہ ہوں — کچھ لوگ میرے خون کے پیاسے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ انہیں کسی روز رات کو کوئی دروازہ یا کھڑکی کھلی مل جائے اور وہ اندر آ کر میرا کام تمام کر دیں — یہ الفاظ ادا کرنے کے بعد وہ چونک سے اٹھے۔ ان کے چہرے پر ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے ان سے کوئی زبردست غلطی ہو گئی ہو۔ پھر انھوں نے مجھے ناراضی کے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ سنو — شکور — اس وقت میں نے جو الفاظ کہے ہیں، کسی دوسرے کو معلوم نہ ہوں — چنانچہ میں نے یہ بات کبھی کسی کو نہیں بتائی — آج جب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں تو میں صرف آپ کو بتا رہا ہوں، اور وہ بھی آپ کے کہنے پر —" یہاں تک کہہ کر شکور خاموش ہو گیا —

"اس کا مطلب ہے، کچھ لوگ ان کی جان کے دشمن تھے، لیکن خون کے وہ پیاسے تو ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور وہ اپنے ہی کسی مہربان کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے — شکور صاحب! میں ذرا باورچی خانہ دیکھنا چاہتا ہوں — تاکہ معلوم ہو سکے، آپ نے چائے کہاں بنائی تھی — کپ کہاں رکھا تھا — اور آپ کہاں کہاں سے گزرتے ہوئے خان احمد کے کمرے میں داخل ہوئے تھے اور یہ بھی بتائیں کہ چائے آپ چائے دانی میں کیوں نہیں لے جاتے رہے —"

"خان احمد تکلفات کے عادی نہیں تھے۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے، کیونکہ آپ ان کے دوست ہیں۔ انھوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ چائے کے ایک کپ کے لیے میں پوری ایک ٹرے کی الجھن میں نہ پڑا کروں۔ بس ایک کپ چائے تیار کیا اور یہاں لے آئے — اب آئیے میں آپ کو باورچی خانہ دکھا دوں:"

وہ اس کے ساتھ باورچی خانے میں آ گئے۔ باورچی خانے میں ایک دروازہ اور دو کھڑکیاں تھیں۔ کھڑکیوں میں سلاخیں نہیں تھیں۔ ایک کھڑکی کے ساتھ چولہے اور برتن وغیرہ رکھنے کے

لیے الماری نصب تھی ۔ کھڑکی کے ساتھ ایک لمبی سی میز رکھی تھی۔ اس میز پر برتن وغیرہ رکھ کر چائے تیار کی جاتی تھی یا کھانا وغیرہ رکھا جاتا تھا۔

"ہاں تو چائے کا کپ کہاں تھا؟"

"جی یہاں ۔۔۔" اس نے کھڑکی کے سامنے ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا۔۔۔

"اور چائے بناتے وقت آپ ادھر اُدھر بھی ہوئے ہوں گے ۔۔۔"

"اچھی طرح تو یاد نہیں ۔۔۔ شکر اور چائے نکالتے وقت منہ الماری کی طرف ہوتا ہے"

"آصف ۔۔۔ تم باورچی خانے سے باہر جاؤ اور جب شکور صاحب چائے اور شکر نکالنے کے لیے الماری کی طرف مڑیں تو اس وقت اچانک اپنا ایک ہاتھ کھڑکی میں سے کپ تک لے آنا ، خیال رہے کہ اس سے پہلے تم نیچے دبکے رہو گے۔"

"جی بہتر" اس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا اور جب انسپکٹر کامران مرزا نے یہ اندازہ کر لیا کہ وہ کھڑکی کے نیچے پہنچ گیا ہوگا تو انھوں نے کہا ۔۔۔

"اب آپ شکر اور چائے نکالیں"

"جی اچھا" اس نے کہا اور الماری کی طرف مڑ گیا ۔۔۔

جی وہ دونوں چیزیں نکال کر فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ آصف کا ہاتھ کپ تک آیا اور واپس چلا گیا ۔۔۔ اس کے بھی کوئی پندرہ سیکنڈ بعد شکور میز کی طرف مڑا۔

"بس آصف ۔۔۔ اب تم آ جاؤ ۔۔۔ قاتل کے لیے کافی وقت تھا ۔۔۔ وہ کپ میں زہر کا سفوف نہایت آسانی سے ڈال سکتا تھا ۔۔۔ اسے راستے میں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ راستے میں شکور بابا اسے دیکھ لیتے"

اس وقت انھوں نے دروازے کی گھنٹی بجنے کی آواز سنی۔ آواز سب انسپکٹر شاہد کی تھی ۔۔۔ وہ شکور سے رخصت ہو کر اپنے کمرے کی طرف آ گئے ۔ اسی وقت شاہد بھی وہاں پہنچ گیا۔

"رپورٹیں حاضر ہیں جناب" اس نے کاغذات ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر کامران مرزا انہیں پڑھنے لگے ۔۔۔ آفتاب، آصف اور فرحت بھی ان کے ساتھ ساتھ پڑھتے چلے گئے ۔ ان کے مطابق خان احمد کی موت اسی زہر سے ہوئی تھی جو زہر خاور احمد کی الماری میں موجود تھا۔ زہر اس چائے میں بھی شامل تھا ، جو رات کے وقت انہیں دی گئی ۔۔۔ زہر کی شیشی پر بھی خاور احمد کے سوا کسی اور کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملے۔

"اف خدا ۔۔۔ تو خاور احمد ہی قاتل ہے" فرحت بڑبڑائی۔

"اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس گھر کے سب دروازے بند تھے۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ باہر سے کسی آدمی کے آنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ تو پھر صاف ظاہر ہے کہ قاتل گھر میں ہی موجود تھا — گھر میں تین ملازم، تین مہمان، وکیل صاحب، خاور احمد اور تم تینوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ تم تینوں تو قاتل ہو ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا سب سے پہلے تمہیں اس فہرست سے نکال دیتے ہیں۔ رہ گئے تین ملازم — ان تینوں کو خان احمد کی وفات کے بعد دس دس ہزار روپے ملنے تھے — شاید ان میں سے کسی کو بہت شدید ضرورت آ پڑی ہو اور اس نے اس خیال سے خان احمد کو زہر دے دیا ہو کہ فوری طور پر دس ہزار روپے مل جائیں گے۔ لیکن دس ہزار جیسی معمولی رقم تو خان احمد ملازموں کو ضرورت پڑنے پر ویسے بھی دے سکتے تھے۔ کسی ملازم کو اتنا خوفناک اقدام کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی — اب رہ گئے وکیل صاحب — وصیت نامے میں ان کے لیے کوئی رقم نہیں رکھی گئی۔ شاید انہیں معقول تنخواہ دی جاتی رہی ہو گی — لہٰذا خان احمد کے قتل سے وکیل صاحب کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اب لے دے کے ایک خاور احمد ہی رہ جاتا ہے اور اس کے پاس بہت بڑی وجہ موجود ہے — دولت فوری طور پر حاصل کرنا — یوں بھی وہ خان احمد

کا خون نہیں تھا۔ انہیں قتل کا منصوبہ بناتے وقت اسے رحم نہیں آیا ہو گا — اس باپ کو قتل کرتے ہوئے — جس نے اسے ماں کی طرح پالا — پوسا — اعلیٰ تعلیم دلائی — اور مرنے سے پہلے اپنی ساری جائداد اور تین چوتھائی دولت اس کے حوالے کر گیا — افسوس صد افسوس —" انسپکٹر کامران مرزا یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئے۔

"تو کیا آپ خاور احمد کو گرفتار کر رہے ہیں؟" آصف نے پوچھا —

"ابھی نہیں — پہلے ان تینوں کو گرفتار کرنا ہے۔" وہ بولے۔

"کیا ان تینوں میں سے کوئی قاتل نہیں ہو سکتا؟"

"نہیں — انہیں آئے تو چند گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے۔ انہیں یہ بات کس طرح معلوم ہو سکتی تھی کہ اس گھر کے ایک کمرے میں دواؤں کی ایک الماری بھی ہے اور اس الماری میں وہ زہر بھی موجود ہے جو خان احمد کو ہلاک کرنے کے کام آ سکتا ہے اور پھر انہیں قتل کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا — وہ تو خان احمد کو بلیک میل کرنے کا پروگرام بنا کر آئے تھے — جس سے رقم حاصل ہونے کی امید ہوتی ہے۔ اُسے قتل نہیں کیا جا سکتا — جب انہوں نے دیکھا کہ خان احمد کو قتل کر دیا گیا ہے تو یہاں سے فرار کا منصوبہ سوچنے لگے — تاکہ قتل کے کیس کی

تحقیق اور عدالتوں میں گواہیوں وغیرہ کی اُلجھنوں سے بچا سکیں۔
میں ان کا منصوبہ سمجھ گیا اور انہیں بھاگنے کا موقع دے دیا تاکہ
یہ معلوم ہو سکے کہ وہ چاہتے کیا ہیں اور یہ ہمیں فوراً ہی معلوم
ہو گیا۔ اب ہم رات بارہ بجے تک بالکل فارغ ہیں۔ لہٰذا میں
دفتر جاؤں گا اور تم لوگ بھی مزید سوچ بچار کر لو۔ دروازے
پر بدستور پہرہ موجود رہے گا اور کوئی شخص بغیر اجازت کہیں
نہیں جا سکتا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور رات کے
بارہ بجے وہ حویلی کے پیچھے درختوں کی اوٹ لیے کھڑے تھے۔
اردگرد درختوں کے پیچھے شاہد اور اس کے بہت سے ماتحت بھی
موجود تھے۔ درختوں پر سرچ لائٹیں بھی لگا دی گئی تھیں۔
یوں بھی آج چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ آخر ٹھیک
بارہ بجے ایک طرف سے تین سائے حویلی کی طرف بڑھتے نظر
آئے۔

چہرہ بولتا ہے

"ہیلو، تو تم لوگ۔ جہاں ہو، وہیں ٹھہرو۔ آگے بڑھنے کی
بجائے وہاں رہ کر بات کرو۔" انسپکٹر کامران مرزا نے نادر احمد کی
آواز میں کہا۔ نادر احمد بھی ان کے پاس ہی موجود تھا۔
"کیوں۔ کیا تمہیں ہم سے ڈر لگ رہا ہے؟"
"نہیں، ہاں تو وہ کیا ثبوت ہیں جو تمہارے پاس ہیں۔ میں
ان کی تفصیلات جاننا چاہتا ہوں۔"
"ثبوت کی تفصیل ہم ابھی بتا دیتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے
اتنا سن لو کہ ہم اپنے کچھ دوستوں کو تمام حالات بتا آئے ہیں۔ اگر
ہمارے ساتھ دھوکا کرنے کی کوشش کی گئی تو ہمارے دوست
ساری تفصیل اخبارات میں اشتہار کی صورت میں شائع کرا دیں گے۔"
"چلو ٹھیک ہے۔ ثبوت پیش کرو۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔
"بچے کو جس وقت حویلی کے دروازے پر چھوڑا گیا۔ اس
کے جسم پر سرخ رنگ کے کپڑے تھے۔ ان کپڑوں پر سنہری

دھاگے سے پھول نکالے گئے تھے ___ اس کے گلے میں نقلی موتیوں کا ایک سفید رنگ کا ہار تھا۔ اس ہار کا دھاگا سبز رنگ کا تھا بچے کی کمر پر تین ابھرے ہوئے سیاہ تل موجود تھے جو آج بھی موجود ہوں گے ___ ان سیاہ تلوں کو بچے کی ماں دیکھ کر فوراً پہچان سکتی ہے۔ اور لباس دیکھ کر بھی وہ فوراً کہہ اٹھے گی یہ تو اس کے بچے کے کپڑے ہیں اور موتیوں کا یہ ہار بھی اسی کے بچے کے گلے میں تھا۔ بچے کے پیروں میں اس وقت ہاتھ کے بنائے ہوئے جوتے بھی تھے ___ وہ جوتے ہمارے پاس ہیں۔ ان جوتوں کے اندر سلائی میں کاغذ بھی استعمال کیا گیا تھا۔ یہ کاغذ اس عورت کے خاوند کا خط تھا ___ جو اس نے کسی دوسرے شہر سے بھیجا تھا ___ بچے کی ماں نے جب بچے کے لیے جوتا تیار کیا اور اس سلسلے میں کاغذ کی ضرورت پڑی تو اس نے وہ خط بھی اس میں سی دیا۔ یہ خط ہمارے پاس موجود ہے۔ خان احمد نے بچے کے کپڑے اور ہار وغیرہ ضائع نہیں کیے ہوں گے۔ کیونکہ وہ ضائع کر ہی نہیں سکتے تھے۔ قدرتی طور پر تو وہ یہی چاہتے رہے ہوں گے کہ اس بچے کے والدین اگر کبھی آ گئے تو نشانیاں پوچھ کر واپس کر دیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک دو دن میں ہی بچے کی محبت ان کے دل میں گھر کر گئی اور وہ اسے اپنا بیٹا خیال کرنے لگے ___ اب اگر اس کی ماں

کے سامنے جوتے اور دوسری سب چیزیں اور وہ خط بھی رکھا جائے تو کیا یہ بات ثابت نہیں ہو جائے گی کہ بچہ دراصل اس عورت کا ہے ___ ان ثبوتوں کو کون جھٹلا سکتا ہے ___ ہم اس عورت کا پتا جانتے ہیں۔ جب ہم جوتیاں اس کے پاس لے جائیں گے تو وہ انہیں دیکھ کر پاگل ہو جائے گی اور ہمارے ساتھ دوڑی آئے گی ___ پھر یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ نادر احمد دراصل خان احمد کے بیٹے نہیں ہیں اور جب یہ بات ایک بار ثابت ہو گی۔ تو پھر اخبارات میں اس کا خوب چرچا ہو گا اور خان احمد کے رشتے دار اسی وقت دعویٰ کر دیں گے کہ نادر احمد اس دولت اور جائیداد کے ہرگز ہرگز مالک نہیں ہو سکتے ___ تو یہ ہیں وہ تمام ثبوت۔ یہاں تک کہہ کر الطاف خان خاموش ہو گیا۔

"لیکن تمہارے پاس وہ جوتیاں کس طرح پہنچیں۔ تمہیں میری ماں کے بارے میں کس طرح معلوم ہوا؟" انہوں نے نادر احمد کی طرف سے پوچھا۔

"آپ کو ان باتوں سے کیا ___ جا کر تجوری کے خانوں کو خود سے دیکھیں ___ آپ کو اپنے کپڑے وغیرہ مل جائیں گے۔ پھر کسی سے اپنی کمر دیکھنے کے لیے کہیے گا۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ آپ کی کمر پر تین ابھرے ہوئے سیاہ تل بھی ہیں ___"

"ٹھیک ہے۔ تمہارے پاس مکمل ثبوت موجود ہے — میں پچاس لاکھ دینے کے لیے تیار ہوں، لیکن پچاس لاکھ روپے کا بندوبست فوری طور پر تو نہیں ہو سکتا۔ گھر میں یوں بھی قتل کی تفتیش ہو رہی ہے — اس لیے تمہیں چند دنوں تک انتظار کرنا ہو گا۔"

"ضرور کیوں نہیں — ہم نے تو بہت لمبا انتظار کیا ہے۔"

"چند دنوں کی کیا بات ہے۔" اصغر خان نے کہا پھر اس کے منہ سے گھبرائی ہوئی آواز میں نکلا:

"ارے! یہ کیا!"

"کیا ہوا؟" انسپکٹر کامران مرزا نے مسکرا کر پوچھا۔

"سر! ہم نے انہیں پکڑ لیا ہے۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں پستول بھی تھے — پستولوں کا بندوبست ہم نے پہلے کیا اور ان پر ہاتھ بعد میں ڈالا۔"

"بہت خوب! اب تم انہیں حویلی میں لے آؤ — آئیے خاور احمد صاحب —"

"اف خدا — یہ سب کیا ہے۔"

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی باتیں کہاں تک درست ہیں۔" انہوں نے کہا۔

حویلی میں پہنچ کر خاور احمد کی تجوری کو کھولا گیا۔ اس کے ایک ایک خانے کی تلاشی لی گئی اور آخر اس کے ایک خانے میں

سے ایک بچے کے کپڑے اور موتیوں کا ایک ہار مل گئے — کپڑے سرخ رنگ کے تھے اور اس پر ماں نے اپنے ہاتھ سے سنہری دھاگے سے پھول بنائے تھے — اب خاور احمد کی کمر سے کپڑے ہٹا کر دیکھا گیا — یہاں تین ابھرے ہوئے تل بھی موجود تھے۔ یہ دیکھ کر انسپکٹر کامران مرزا بولے:

"شاہد، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان تینوں نے بچے کو اغوا کیا تھا — یہی وجہ ہے کہ یہ سارے حالات سے واقف ہیں اور ایک ایک تفصیل بتا رہے ہیں — تم ان تینوں کو لے جاؤ اور اغوا کرنے والوں کا ریکارڈ کھنگال ڈالو — شاید ان تینوں کا بھی کوئی ریکارڈ ہو — اس کے بعد انہیں ان کے گھروں تک لے جانا اور وہاں سے وہ جوتیاں حاصل کرنا — جو یہ اس بچے کی بتاتے ہیں۔ اس کے بعد ان سے بچے کی ماں کا پتا معلوم کرنا ہے — اگر یہ تعاون نہ کریں تو مجھے فون کر دینا۔ اس کے بعد میں ان کے منہ سے سب کچھ اگلوا لوں گا — یہ فر فر بولنے لگیں گے — بس اب تم جاؤ اور جلد از جلد مجھے فون کرنے کی کوشش کرو — بلکہ خود ہی چلے آنا — کیونکہ ابھی ہمیں قاتل کو بھی گرفتار کرنا ہے۔"

"جی بہتر۔" شاہد نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ایک گھنٹے بعد شاہد کی صورت دوبارہ نظر آئی۔ اس نے آتے ہی کہا:

"آپ کا اندازہ درست نکلا۔ وہ تینوں واقعی بچوں کو اغوا کرتے رہے ہیں۔ ان کا باقاعدہ ریکارڈ موجود ہے — ان میں سے اعجاز خان کے گھر سے بچے کی جوتیاں بھی مل گئی ہیں — ان کا بھی پتا چل گیا ہے۔ لیکن ابھی میں باہر سے ہی اس کا گھر دیکھ کر آیا ہوں۔"

"تم نے اچھا کیا — میرے خیال میں اب اسے یہ بتانے کا فائدہ ہی نہیں کہ اس کا بیٹا مل گیا ہے، کیونکہ ایک قاتل بیٹے سے مل کر اسے اور بھی دکھ ہوگا اور شاید وہ اس صدمے کو برداشت کر ہی نہ سکے۔"

"یہ — یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے خاور احمد صاحب — اس گھر میں موجودہ حالات میں کوئی اور قاتل ہو ہی نہیں سکتا — میں نے حالات کا بہت غور سے جائزہ لیا ہے — قاتل آپ اور صرف آپ ہیں۔ میں نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ اپنے وکیل کا بندوبست کر لیں، لیکن آپ نے توجہ نہیں دی — اب بھی میں یہی کہتا ہوں کہ آپ کسی بہت اچھے وکیل کا انتظام کریں — کیونکہ یہ کیس میں تیار کر کے عدالت میں لے جاؤں گا اور میرا تیار کیا ہوا کیس آج تک خارج نہیں ہوا۔"

"نہیں نہیں — میں قاتل نہیں ہوں — میں قاتل نہیں ہوں۔"

"ہر قاتل یہی کہتا ہے جناب — ہر قاتل یہی کہتا ہے۔"

انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

شاہد کے اشارے پر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں — جب کہ سب افراد پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے رہ گئے اور جس وقت اسے حویلی سے باہر لے جایا جا رہا تھا، وکیل نے کہا۔

"لیکن — انسپکٹر صاحب — اب اس جائداد اور دولت کا کون وارث ہوگا۔"

"خان احمد کے عزیز — رشتے دار — خان احمد کے کاغذات میں ان کے بارے میں ضرور کچھ ہوگا۔ اب یہ آپ کا کام ہے۔"

"اور گھر کے ان ملازموں کا کیا کیا جائے۔"

"ان کا — میرے خیال میں انہیں چھ چھ ماہ کی تنخواہ آپ تجوری میں سے دے دیں۔ تاکہ یہ بیچارے اپنے اپنے گھروں کو جا سکیں — جب نئے مالکان آئیں گے تو اس وقت یہ اپنی نئی ملازمت کے لیے ان سے بات کر سکتے ہیں —"

"یہ ٹھیک رہے گا۔"

"ہاں — جب آپ نئے مالکان کو جائداد سونپیں تو چھ ماہ کی تنخواہ کا حساب بھی انہیں بتا دیں۔"

"ٹھیک رہے گا۔"

اور وہ اُٹھ کھڑے ہوئے — اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ ان کے قدم بوجھل ہو رہے تھے — طبیعتیں بھاری ہو رہی تھیں —

"انسان بھی کیا ہے — تین آدمیوں نے ایک آدمی کے لڑکے کو صرف اس لیے اغوا کیا کہ جب وہ بڑا ہو جائے گا تو وہ بلیک میلنگ کے ذریعے بے تحاشہ دولت حاصل کریں گے — لیکن وہ یہ دولت حاصل نہ کر سکے — ادھر اس لڑکے نے جوان ہو کر اپنے پرورش کرنے والے کو ہی مار ڈالا — تاکہ دولت جلد حاصل کر سکے۔ لیکن اسے بھی دولت نہ مل سکی — اور جیل یا پھانسی اس کا مقدر بن گئی — آخر کیوں — یہ انسان اتنا لالچی کیوں ہے — جو اسے جائز راستے سے مل سکتا ہے، یہ اس پر قناعت کیوں نہیں کرتا۔ صبر کیوں نہیں کرتا — ہمارا مذہب قناعت کرنے پر کتنا زور دیتا ہے اور صبر کی کس قدر تلقین کرتا ہے۔ لیکن یہ حضرت آدم ہے کہ بس — صرف دولت کا غلام بن کر رہ گیا ہے —" فرحت افسوس زدہ لہجے میں کہتی چلی گئی —

"ہاں فرحت تم ٹھیک کہتی ہو — لیکن انسان اس سے بھی کہیں زیادہ لالچی بنتا جا رہا ہے۔ جتنا کہ ہم نے مشاہدہ کیا:" انسپکٹر کامران مرزا بولے اور کار میں گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔ آج آفتاب کچھ نہیں بولا تھا۔

"کیوں آفتاب! تم کیوں خاموش ہو؟"

"میں اُس ماں کے بارے میں سوچ رہا ہوں جس کا بیٹا اغوا کر لیا گیا تھا اور جس کا بیٹا اسے کبھی نہیں مل سکے گا — مگر نادر احمد کو عمر قید وغیرہ بھی ہو گئی تو کیا وہ عورت اس وقت تک زندہ رہے گی — جب وہ جیل سے نکلے گا — بہت مشکل ہے:"

"ہاں — واقعی — لیکن یہ ناممکن نہیں:" آصف نے کہا اور ایک بار پھر کار میں خاموشی چھا گئی — شاید اُن کا دل باتیں کرنے کو چاہ ہی نہیں رہا تھا۔

○

انسپکٹر کامران مرزا کے گھر کے فون کی گھنٹی بجی — وہ ابھی ابھی دفتر سے لوٹے تھے اور ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے — آفتاب آصف اور فرحت بھی کرسیوں پر موجود تھے — شہناز بیگم ابھی چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی باہر نکل رہی تھیں کہ گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو! انسپکٹر کامران مرزا بول رہا ہوں:" انھوں نے ریسیور اُٹھا کر کہا۔

"السلام علیکم جناب — میں وکیل بہار علی بول رہا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا، چند دن پہلے خان احمد مرحوم کی حویلی میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"اوہو — وکیل صاحب آپ ہیں — بھلا یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔ آپ مجھے اچھی طرح یاد ہیں — سنائیے — کیسے فون کرنے کی زحمت کی۔"

"میں ایک پریشانی میں مبتلا ہوگیا ہوں۔" ادھر سے کہا گیا۔

"اور اسی پریشانی میں میں آپ کی وجہ سے ہی گرفتار ہوا ہوں۔" وکیل نے پھر کہا۔

"میری وجہ سے — اطمینان رکھیے، اگر آپ میری وجہ سے کسی پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں تو پھر میں ہی آپ کو اس سے نجات بھی دلاؤں گا — بتائیے کیا بات ہے۔"

"ایسے بات نہیں بنے گی، اگر آپ زحمت کریں اور یہیں آجائیں تو آسانی رہے گی۔"

"بہت بہتر۔ میں آجاتا ہوں — آپ بتائیے — کہاں سے بول رہے ہیں۔"

"حویلی سے ہی —"

"جی — کیا فرمایا — حویلی سے ہی۔" انسپکٹر کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا۔ آفتاب، آصف اور فرحت کے بھی کان کھڑے

ہوئے۔ اس وقت تک انھوں نے اپنے کان ریسیور کے قریب نہیں کیے تھے، لیکن اب وہ فوراً آگے بڑھ آئے۔

"جی ہاں! میں اس وقت حویلی میں موجود ہوں۔"

"اچھی بات ہے — ہم آدھ گھنٹے تک پہنچ رہے ہیں۔" انھوں نے جواب دیا۔

"بہت بہت شکریہ۔ میں بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا گیا۔

"وکیل بہار علی کا فون تھا۔ وہ اس وقت خان احمد کی حویلی میں موجود ہیں — اور کسی پریشانی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اسی پریشانی میں میری وجہ سے مبتلا ہوئے ہیں۔"

"حیرت ہے — بھلا وہ حویلی میں کیا کر رہے ہیں اور وہ کیا پریشانی ہے جس میں وہ مبتلا ہو گئے ہیں۔" آفتاب بولا۔

"یہ تو وہیں چل کر معلوم ہو سکتا ہے۔"

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد وہ حویلی میں داخل ہو رہے تھے — دروازہ خود وکیل صاحب نے ہی کھولا تھا۔

"ہمیں حیرت ہے جناب — آپ یہاں کیا کر رہے ہیں!"

"نادر احمد کے جیل چلے جانے کے بعد اس جائداد وغیرہ کا میں ہی نگران ہوں جناب — اور اب جب کہ نئے مالکان

یہاں آ گئے ہیں۔ تو میں انہیں تمام چیزیں سونپنے کے لیے آیا
ہوں —

"اوہ — تو خان احمد کے عزیز رشتے دار مل گئے"

"انھوں نے خود ہی عدالت میں مقدمہ دائر کیا تھا۔ اخبارات
میں تمام تفصیلات پڑھ کر ہی وہ حالات سے آگاہ ہوئے ہیں۔
انھوں نے اپنی خان احمد سے رشتے داری ثابت کر دی ہے — اور
عدالت نے ان کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے"

"بہت خوب — یہ خان احمد کے کیا لگتے ہیں"

"خان احمد مرحوم کی سگی چھوٹی بہن اور ان کے خاوند ہیں"

"تو آپ کو پریشانی کیا لاحق ہو گئی ہے"

"بات دراصل یہ ہے جناب —" وکیل نے کہنا شروع کیا۔
ساتھ ساتھ وہ چل بھی رہے تھے — "میں زیادہ بڑا وکیل نہیں
ہوں۔ ابھی مجھے پریکٹس کرتے زیادہ عرصہ گزرا ہے — میں ہوں
بھی ایک غریب گھرانے کا — محنت مزدوری کر کے میں نے اپنی
تعلیم مکمل کی ہے — اور اب بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں
یعنی اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا ہوں — بس گزر بسر ہو رہی ہے"

وکیل کے الفاظ ان کی حیرت میں اضافہ کر رہے تھے، کیونکہ
ابھی تک اس کی کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ
کس پریشانی میں مبتلا ہو گیا ہے — اس وقت وہ ڈرائنگ روم

تک پہنچ گئے — وہ سب سے پہلے اندر داخل ہوا۔ وہ چاروں اس
کے پیچھے تھے۔ انھوں نے دیکھا، اندر ادھیڑ عمر کے مرد اور عورت
صوفوں پر نیم دراز ہیں۔ مرد کا چہرہ ڈاڑھی اور مونچھوں سے
بے نیاز تھا۔

"ان سے ملیے — یہ انسپکٹر کامران مرزا ہیں۔ انھوں نے
خان احمد مرحوم کے قتل کی تفتیش کی تھی — اور جناب یہ خان احمد
مرحوم کی چھوٹی بہن اور یہ ان کے شوہر ہیں"

"آپ لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی۔ میری طرف سے اس
جائداد کے ملنے پر مبارک باد قبول فرمائیے"

"شکریہ جناب" عورت بولی۔

"وکیل صاحب، اب میں آپ کی وہ پریشانی جاننا چاہتا ہوں"

"جی ہاں — آپ کو یاد ہوگا — خاور احمد کی گرفتاری کے
بعد میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ گھر کے ملازمین کا کیا کیا جائے
تو آپ نے مشورہ دیا تھا کہ انھیں چھ چھ ماہ کی تنخواہ دے کر
رخصت کر دیا جائے — چنانچہ میں نے یہی کیا تھا۔ پانچ ملازموں
کو چھ چھ ماہ کی ہی تنخواہ دی گئی تھی۔ وہ تقریباً بیس ہزار روپے
بنی تھی — اب جب میں نے ان لوگوں کو ساری جائداد کا حساب
دیا تو انھوں نے اور تو ہر حساب درست تسلیم کر لیا، لیکن
وہ بیس ہزار روپے کا خرچ یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ ان کا

کیا ہے کہ بے ملازمین کو چھ چھ ماہ کی تنخواہ دینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ انہیں زیادہ سے زیادہ ایک ایک ماہ کی تنخواہ دی جانی چاہیے تھی۔ لہٰذا جو زائد رقم دی گئی وہ ادا کی جائے — اب آپ ہی بتایئے، میں کیا کروں۔ اپنے حالات میں یہاں تک آتے ہوئے آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جی ہاں — بات تو صرف اتنی ہی ہے۔ لیکن یہ میرے لیے ایک مسئلہ ہے — میرے پیشے پر کوئی حرف آئے — میرے لیے اور بھی نقصان دہ بات ہو گی۔" بہادر علی نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں — یہ کارروائی آپ نے میرے مشورے پر کی تھی۔ لہٰذا ان کی رقم میں ادا کیے دیتا ہوں۔ اگر آپ فون پر ہی ساری بات بتا دیتے تو میں رقم ساتھ لے کر آتا۔"

"خیر وہ تو کوئی بات نہیں — کسی وقت بھی آپ دے سکتے ہیں۔" عورت کے شوہر نے پہلی بار زبان ہلائی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے کان کو زور سے کھجایا۔

اسی وقت انسپکٹر کامران مرزا کو اچانک ایک عجیب سا احساس ہوا۔ انہوں نے پہلے تو حیرت بھرے انداز میں آفتاب، آصف اور فرحت کو دیکھا اور پھر وکیل کو۔ آخر میں عورت اور اس کے خاوند پر نظر ڈالی۔ پھر بولے:

"کل صبح میں آپ کی رقم لے کر یہاں آؤں گا۔ آپ یہیں ملیں گے نا؟"

"جی بالکل — ہم بھلا کہاں جائیں گے اب۔" مرد بولا —

"ٹھیک ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ وکیل صاحب — آپ نے ان کے حساب سے کتنی رقم زائد ادا کی ہو گی؟"

"تقریباً پندرہ ہزار روپے۔"

"بہت اچھا — اب ہم اجازت چاہیں گے — لیکن میں چلنے سے پہلے ایک سوال ضرور کروں گا — اور وہ یہ کہ خان احمد نے اپنے وصیت نامے میں آپ لوگوں کو کیوں یاد نہیں رکھا؟"

"وہ ہم سے ناراض تھے۔" اس مرتبہ عورت بولی۔

"کیوں — ناراض کس لیے تھے؟"

"میں نے ان کی مرضی کے خلاف ان سے شادی کر لی تھی — بس اسی روز سے وہ ہم سے ناراض تھے — انہوں نے ہم سے ملنا جلنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔"

"ہوں — تو یہ بات تھی — اور انہوں نے آپ کو دولت اور جائداد میں سے کوئی حصہ بھی نہیں دیا ہو گا۔"

"جی نہیں — میں بالکل خالی ہاتھ اس حویلی سے نکلی تھی —" عورت کے لہجے میں ہلکا سا غصہ تھا۔

"اب تو خاں احمد اس دُنیا میں نہیں ہیں اور آپ کو ان
کی ساری دولت اور جائداد بھی مل چکی ہے۔ اب آپ کو خطرہ کس
بات کا ہے؟" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"خطرہ — نہیں تو —" عورت نے کہتے ہچکچائے۔

"خیر — اب مجھے معلوم ہو گیا کہ خاں احمد روزانہ حویلی کے
دروازے اور کھڑکیاں اپنی موجودگی میں کیوں بند کروایا کرتے تھے
وہ دراصل آپ کے خاوند سے خوف زدہ تھے — وہ آپ دونوں ہی سے
خوف زدہ رہتے تھے — شاید آپ دونوں نے انہیں کوئی دھمکی
دی ہو گی — کیوں یہی بات ہے نا؟"

"نہیں — ہم نے انہیں کوئی دھمکی نہیں دی — یہ غلط ہے"
خاوند نے کہا۔

"لیکن آپ کا چہرہ یہ کہہ رہا ہے کہ آپ نے انہیں کوئی
بہت ہی خوفناک دھمکی دی تھی — آپ نے ان سے یہ کہا ہو گا
کہ آپ انہیں جان سے مار دیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے
پُر اسرار لہجے میں کہا

"چہرہ کہہ رہا ہے — کیا مطلب!" وہ تعجب کے لہجے میں بولی
حیرت تھی —

"ہاں، کچھ لوگوں کے چہرے بھی بولتے ہیں — [illegible] ان کے
چہرے کو غور سے دیکھو — اور تصور کرو — کہ ان کے چہرے

... ذرا سی بھی ہے — اور باریک سی مونچھیں بھی — پھر تمہیں معلوم
ہوا کہ اس وقت جو مرد ہمارے سامنے بیٹھا ہے، وہ دراصل
گھر کا ملازم شکور ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا روانی کے عالم
میں کہتے چلے گئے۔

"کیا!!!" وہ سب اچھل پڑے۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ
گئیں۔ دوسری طرف عورت کا خاوند بُت بن کر رہ گیا۔

"ہاں۔ جب اس شخص نے اپنے کان کو زور سے جھاڑا تو
میں اسی وقت چونک اٹھا تھا۔ مجھے فوراً یاد آ گیا کہ حویلی کے اندر
بھی میں نے ایک آدمی کو کان بالکل اسی انداز میں جھاڑتے دیکھا
تھا — اور وہ شکور تھا — یہ بات مجھے اچھی طرح یاد تھی۔
دوسرے یہ کہ یہ اس وقت اپنی آواز بدل کر بولنے کی کوشش
کر رہے تھے —"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے پستول اپنی جیب سے نکال کر
اس کی نال کا رُخ ان دونوں کی طرف کر دیا اور بولے

"اب معاملہ صاف ہو گیا — چائے میں زہر دراصل شکور
صاحب نے خود ہی ملایا تھا — خاور احمد کی زنجیر انہوں نے ان کے
کمرے سے صبح سویرے اس وقت اٹھائی ہو گی جب خاور احمد
صبح کی سیر کے لیے چلے گئے — ابھی کریم صفائی کے لیے کمرے
میں داخل بھی نہیں ہوا ہو گا کہ یہ اندر جا کر زنجیر اٹھا لائے —

زہر انہوں نے چند روز پہلے شیشی سے اُڑا لیا ہوگا۔ یہ یہاں دس
سال پہلے ملازم ہوئے تھے — تاکہ کوئی ان پر شک نہ کرے۔
بہت پرانا ملازم جان کر ان کی طرف توجہ بھی نہ دے۔ ہوا بھی
یہی۔ انہوں نے حالات ایسے پیدا کر دیے کہ شک خاور احمد
کی طرف ہو گیا — حالات پہلے ہی ان کے خلاف تھے —
اس میں اُن کی طبیعت کو بھی دخل تھا — چنانچہ انہیں گرفتار کر
لیا گیا اور ان کی طرف کسی کا شک بھی نہیں گیا۔ شیشی کو انہوں
نے احتیاط سے انگلیوں پر رُومال لپیٹ کر کھولا ہوگا۔ تاکہ ان
کی انگلیوں کا نشان نہ لگنے پائے — یہاں آتے ہی یہ اس
لیے خان احمد کو ہلاک نہ کر سکے۔ کیونکہ خاور احمد شک سے
باہر گئے ہوئے تھے اور یہ انہیں بطور قاتل پھنسانا چاہتے تھے۔
تاکہ جائداد بھی لگے ہاتھوں ہتھیا لیں۔ ان کا منصوبہ ان کی مرضی
کے عین مطابق مکمل ہوتا چلا گیا — انہوں نے جائداد کا مقدمہ
بھی جیت لیا اور یہاں بھی پہنچ گئے۔ لیکن ذرا ان کا لالچ
ملاحظہ ہو کہ پندرہ بیس ہزار کے معاملے پر اڑ گئے اور اس طرح
مجھے یہاں آنا پڑا — یہ بھی خدا کی قدرت ہے۔ ورنہ خاور احمد
بے گناہ پھانسی کے تختے پر چڑھ جاتا — ہاں تو شکور صاحب —
یا جو کچھ بھی آپ کا نام ہے — آپ کو کوئی اعتراض ہو تو بیان کیجیے
لیکن اعتراض کرنے سے پہلے یہ سوچ لیجیے گا کہ کیس کی تفتیش

کے دوران آپ کی انگلیوں کے نشانات یعنی مسٹر شکور کی انگلیوں
کے نشانات بھی لے گئے تھے — اب اگر آپ کی انگلیوں کے
نشانات شکور کی انگلیوں کے نشانات سے مل گئے تو کیا ہوگا؟
یہاں تک کہہ کر انسپکٹر کامران مرزا خاموش ہو گئے — مرد
کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا — اس کا چہرہ لٹک گیا —
عورت کا چہرہ بھی پیلا پڑ گیا —
محمت — شاہد کو فون کرو:
تھوڑی دیر بعد وہ جیل کا رُخ کر رہے تھے۔ ان کے پاس
خاور احمد کی رہائی کا پروانہ تھا اور خاور احمد کو لے کر وہ اس
گھر کا رُخ کر رہے تھے جہاں سے ایک عورت کا بچہ بیس بائیس
سال پہلے اغوا کیا گیا تھا — اور جس کے انتظار میں اس کی آنکھیں
خون کے آنسو رو رہی تھیں —

۲-۷-۹۹